سلسلہ کہکشاں نمبر ۱

قطرات اشک

یعنی

چند دلاویز مضامین

مصنفہ

مصور غم مولوی راشد الخیری دہلوی

مصنف ماہ عجم۔ شاہین و دراج وغیرہ

سنہ ۱۹۳۶ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار پنجم

قیمت ۷/۱ پائی

سلسلۂ کہکشاں نمبر ۱۰

قطراتِ اشک

یعنی

چند دلاویز مضامین

مصنّفہ

مصوّرِ غم مولوی راشد الخیری دہلوی

مصنّف ماہِ عجم۔ شاہین و درّاج وغیرہ

۱۹۳۶ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور۔

بارِ پنجم

قیمت ۱۲ پائی

فہرست مضامین

ماہ جبیںؔ اِندرا

آج سے کئی ہزار برس پہلے جب یہ سنسار موجودہ تمدن و تہذیب سے کوسوں دور تھا، گو آج کل کی بہت سی نعمتوں اور مصیبتوں کا اس وقت ظہور نہ ہوا، مگر نظام عالم کی صورت یہ ہی تھی، جو آج صدیاں بیتے اور جگ گزر جانے پر دکھائی دے رہی ہے۔ انسانی صورتیں ایسی ہی تھیں، پہلو میں دل اسی طرح کے تھے، مگر دل میں جو جب تھا وہ اب نہیں، اور جواب ہے وہ جب نہ تھا، پریم اُن دلوں کا مسکن اور سچی محبت اُن لوگوں کی زندگی تھی، نیلا آسمان جو آج سروں پر چھایا ہُوا ہے جب بھی تھا۔ اور یہ ہی میلی کچیلی دھرتی جو اب پاؤں لگ رہی ہے، اُس سمے بھی تھی، اُن ہی دنوں کی ایک رات کا ذکر ہے، آسمان پر سکونِ مطلق طاری تھا، چھوٹے چھوٹے تارے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، اور پورنماشی کا چاند جمنا کی لہروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا +

دریا کے کنارے ایک جوگی کی منڈھیا تھی، جس کے چاروں طرف ریت کے ذرّے چمک رہے تھے، اندر ایک سادھو آسن جمائے تھا۔ اور پہلو میں ایک حُسن کی دیوی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی سوہنی صورت

سنگار کی محتاج نہ تھی۔ قدرت نے اس کو اپنے ہاتھ سے گھڑا تھا۔ ایک ہلکی سی بلگجی ساڑی اُس کے نازک جسم کو چھپائے ہوئے تھی۔ جس پر سیاہ اور لمبے بال کالوں طرح لہرا رہے تھے۔ سفید براق پیشانی پر ہلکے سے تلک نے موہنی مورت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چاندنی کی روشنی منڈھیا میں سے چھن چھن کر اس ماہ جبین پر پڑ رہی تھی۔ اور چاند اس کے حسن خداداد پر عش عش کر رہا تھا۔ ہرن بارہ سنگھے۔ چکارے۔ اس کے آس پاس کلیلیں کر رہے تھے۔ اور گو آرائش ظاہری کا اُس کے حُسن میں پتہ تک نہ تھا۔ مگر محبت کا سُرمہ آنکھ میں جھلک رہا تھا +

دریا۔ دریا کی لہریں سو گئیں۔ منڈھیا کی پشت کے باغ پر اوس پڑنے لگی۔ کھلے ہوئے پھول پتوں پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ بلبل خاموش بھونرے بے خبر۔ ہرن چوکڑیاں بھولے۔ اور منڈھیا کی اگنی جلتے جلتے راکھ ہو گئی۔ ایک عالم سنسان تھا کہ یہ نازنیں اندازِ دل ربایانہ سے اُٹھی۔ منڈھیا سے باہر آئی چمکتے ہوئے چاند پر نظر ڈالی اور ایک ٹھنڈا سانس بھرتی ہوئی گلاب کے تختہ پر پہنچی۔ ہوا اپنی نازک اُنگلیوں سے زلف عنبریں کے لچھے بنا رہی تھی۔ اور چاند کا سایہ لب نازک پر پروانہ وار گر رہا تھا۔ گلاب کے کٹورا سے پھول چاروں طرف کھلے ہوئے تھے۔ اور پچھلی رات کی ہوا خوشبو میں بسی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ نازنیں ایک ایسی جگہ ٹھٹکی۔ جہاں ہوا کی بدولت چشمہ کا شفاف پانی ایک سدا بہار گلاب کے پھول کے بوسے لے رہا تھا۔ ٹھٹکی اور ٹھٹک کر تھمی۔ تھمی اور تھم کر بیٹھی۔ بیٹھی اور

بیٹھ گڑا بھی۔ اٹھی اور اُٹھ کر منڈھیا میں آئی۔ اور حسرت سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ نرگسی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر نرم اور نازک رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اور پیشانی کا بل قلب مضطرب کی دھڑکن ظاہر کر رہا تھا۔ ابھی یہ آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ جوگی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا "اندرا"!

اندرا۔ ہاں مہاراج!

جوگی۔ من کی چنتا دور ہوئی؟

اندرا۔ ہے مہاراج میری بنتی پر دھیان کیجئے۔ اور اس وشواش کو من سے دور کیجئے۔ راجوں کے راج سری مہاراج میں آپ کی چیری ہوں دیا کیجئے۔ اور میری لاج رکھ لیجئے۔ ہے مہاراج! وہ مانس نہیں تھا۔ رام چندر جی کا اوتار تھا۔ سپنے میں درشن دیئے اور من موہ لیا۔

جوگی۔ اندرا ہٹ جا! پرے ہو جا! تیرے جیو میں پریم نہیں۔ تو استری ہے۔ چاتر ہے۔ تو نے اے اندرا دھوکا دیا میرے راج پاٹ کو دیکھ یہ تمام سنسار ایک دم میں جھلس دوں۔ جلا دوں۔ راکھ کر دوں۔ تو اے اندرا تو۔ اور تیرا سپنا سب بھسم ہو جائیں۔ جا! جا! جا! اندرا دور ہو جا!

(۲)

برسات کی اندھیری رات ہے۔ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہے ہیں۔ اور گھٹا جھوم جھوم کر برس رہی ہے جمنا کے اس کنارے پر جہاں منڈھیا تھی۔ ایک عالی شان محل بنا ہوا ہے۔ جوگی مہاراج کا جوگ ختم

ہوا۔ آج وہ اس سرزمین کا راجہ ہے۔ بڑے بڑے رشی اور منی۔ گیانی اور ودیانی ڈنڈوت کر رہے ہیں۔ گنگا جی کا اشنان۔ مہاراج کی سالگرہ۔ اندرا کی سواری دیوی کے مندر پر دیا بالنے جاتی ہے +

مہارانی اندرا کے حسن کا سکہ روئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آن بان اُس کی سج دھج یوں ہی ہزاروں دل پامال کر چکی تھی۔ اس پر اس کا بناؤ سنگار ایک قیامت تھی کہ چاروں طرف ٹوٹ رہی تھی۔ کوہ نور کو شرمانے والے جواہر نگار بندے کانوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور سات لڑی کا بڑے موتیوں کا گلوبند سینے پر جھلبل جھلبل کر رہا تھا۔ پکھراج اور نیلم کی چوڑیاں دست حنائی کے آگے سربسجود تھیں۔ گورا رنگ اور رنگ میں ملاحت۔ زریں لباس۔ گلابی رنگت۔ کتابی چہرہ۔ قاتل صورت۔ آفت کی رفتار۔ قیامت کی گفتار۔ محبت کی کھری۔ قاف کی پری نشۂ عشق میں چور اندرا۔ جنت کی حور راجہ کے روبرو پہنچی چرن لئے۔ ڈنڈوت کی اور یہ اشیرباد دی۔ مہراج کا راج پاٹ رہتے سنسار تک +

راجہ یوں ہی اندرا کے نام کا دیوانہ تھا۔ صورت دیکھتے ہی دل ہاتھ سے نکل گیا۔ پچھلی باتیں بھول بسر گئیں۔ بے اختیار ہو کر اُٹھا۔ اور دیوانہ وار پیشانی کو بوسہ دیا +

راجہ۔ اندرا! مہارانی اندرا! اس موہنی مورت میں یہ من۔ اور اس من میں یہ کھوٹ +

اندرا۔ میری مہاراج! میرے من میں مانس کی چنتا نہیں۔ وہ راجہ جی

کا اوتار ہے۔ اس کی برہ کی ماری ہوں اور اس کی چِنتا دور نہیں ہوتی +
راجہ ۔ ہٹ ۔ ہٹ ۔ ہٹ جا! اندرا ۔ چلی جا دور ہو جا +

(۳)

پرستش کے قابل ہے شاہجہان کی وہ مقدس سرزمین جس پر اندرا جیسی جُبن کی دیویاں جو ایک عالم سے اپنی وفاداری کی داد لے گئیں پیدا ہوئیں! دنیائے تاریخ۔ ان متبرک ناموں کو آنکھوں پر رکھ کر اُن کے کارناموں پر قربان ہوگی۔ اور جب تک فانی دنیا میں شاہجہان آباد کا وجود ہے۔ عشق اس سرزمین کا طواف اور محبت جُھک جُھک کر سجدے کریگی۔ عقل رسا آج تک حیران ہے۔ قیاس کام نہیں کرتا اور ذہن مجبور ہے۔ کسے اُمید تھی کہ رانیوں کی رانی خلوص کی راجدھانی جگ کی دُلاری اندرا پیاری جُبن کی کان۔ والی ملک کی جان صرف اسی صورت پر جو خواب میں دیکھی عمر عزیز قربان کردیگی!

شاہجہان آباد والے اس کا احسان نہ مانیں۔ اور ہندوستان اس کے نام سے لاعلمی ظاہر کرے۔ مگر یورپ اس کی ہر ادا پر مٹتا رہا۔ اور آج بھی کہ سیکڑوں ہزاروں برس گزر گئے یورپ کے عجائب خانے اس کی تصویر پر ناز کر رہے ہیں +

دِلّی اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ محبت کا پہلا فانوس اندرا کے ہاتھوں اسی کے کھنڈروں میں روشن ہُوا۔ نجابت قدمی نے اُس کے حوصلے بڑھائے۔ عشق نے تاج شاہانہ سر پر رکھا۔ اسی کا صدقہ ہے

کہ آج اس وقت سیکڑوں خاندان اس کے نام سے چل رہے ہیں۔ راجوں کے راجہ اور بادشاہوں کے بادشاہ جن کی آج ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں۔ اس کا کلمہ پڑھتے رہے۔ کس کا منہ ہے کہ اندرا جیسی ماہ جبین پر بیوفائی کا الزام لگادے؟ رانی نہیں چیری اور چیری نہیں کمیری سہی۔ مگر پہلو میں وہ دل رکھتی تھی جس پر آج تک حُسن کی مجسّم دیویاں شکریہ کے پھول چڑھا رہی ہیں +

اللہ بس باقی ہوس! اندرا محبّت کی لاج رکھ گئی! اور ایک عالم کو دکھادیا! خاک ہندوستان سے ایسی وفادار روح پیدا ہوئی جس کا جواب دنیا کے باقی حصّوں سے آج تک نہ ملا +

اب تک نہیں تو اب اور کل تک نہیں تو آج اسی ہندوستان والے سیکڑوں ہزاروں اس ماہ جبین پر جو محبّت کی رسیا آنکھوں کو حُسن کا جلوہ دکھا گئی۔ جس کی ہر ادا بجلی کی طرح دلوں پر گری جس کا ہر انداز تیر کی مانند کلیجوں میں گھسا۔ بیوفائی کا الزام لگائیں گے۔ مگر ان ہی سنگ دلوں میں دو چار نہیں لاکھوں کروڑوں ایسے بھی نکلیں گے جو مہارانی اندرا کے اس استقلال کی داد دیں۔ مٹ گئی۔ اُجڑ گئی۔ برباد ہوگئی سینے پر خون کی ندیاں بہیں۔ بڑے بڑے جان نثار آنکھوں کے سامنے زمین میں لوٹ گئے۔ مگر محبّت کی دُھن میں فرق نہ آیا۔ نت نئے داغ کلیجے پر لگے۔ اور انوکھی انوکھی مصیبتیں سر پر ٹوٹیں لیکن جس صورت پر دل نثار کیا اُس کی یاد ہاتھ سے نہ دی +

ہمیں یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ راجہ اندر کی اس دعا میں کہ اندرا ایک روز اپنے محبوب کے گلے لگے گی۔ سب سے بڑی سفارش اس کی سُندر صورت تھی۔ اور گو زمانہ کی رائے ہمارے موافق نہ ہو مگر ہم علی الاعلان کہیں گے کہ راجہ جو کچھ بھی تھا انسان تھا۔ اندرا حسن کی وہ پوٹ تھی کہ جو ہا فرشتوں نے اس پر درود پڑھی +

ہم اب کہتے ہیں کہ اندرا اگر بڑی عورت نہ تھی۔ اندرا وہ نازنین تھی کہ کوہ نور جیسے ہیرے اس کے ادنیٰ خادم اور تخت طاؤس اس کا معمولی غلام +

زمانہ کتنا ہی بد تہذیب ہو جائے اور انصاف کی آنکھوں پر کیسے ہی تاریک پردے پڑ جائیں لیکن شاہجہان آباد اور اُس کی پوتر دھرتی مہارانی اندرا کا نام تا دمِ واپسیں کلیجہ سے لگا رکھے گا +

(۴)

موسم وہ نہیں۔ مگر وہی جمنا کا کنارہ اور عالی شان محل۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ راجہ ایک طلائی مسہری پر لیٹا ہے۔ پہلو میں رانی اندرا ہے اور گو اس کا جگر حرارت عشق سے تڑپ رہا ہے۔ مگر نازک ہاتھ راجہ کے سر پر مورچھل کر رہے ہیں۔ گرمی قیامت خیز ہے۔ لُو کے تند و تیز جھونکے کائنات کی ہر شے کو جھلسا رہے ہیں لیکن اندرا کی سُندر صورت نے راجہ کو سب تکلیفیں بھلا دیں۔ تاج شاہانہ اندرا کی گود میں ہے۔ اور محبت بھری نظریں اُس کے رُخِ نازک پر!

راج دُلاری نہیں فرشتوں پیاری اندرا اس وقت سبز لباس میں تھی۔ موسم بہار اس کے قدموں پر نثار ہو رہا تھا اور نسرین و یاسمین اس کی گود میں لوٹ رہے تھے۔ راجہ اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا۔ اندرا جیسی نازنین پہلو میں تھی یارائے ضبط نہ رہا تو اُٹھا اور کہنے لگا:۔

"مہارانی۔ یہ سیس تیرے چرن پر ہے"۔

اندرا۔ "ہے مہاراج! اندرا باندی ہے۔ اس کی لاج تمہارے ہاتھ"۔

اتنا کہہ کر اندرا نے اپنے دست سیمیں راجہ کے گلے میں ڈال دیئے۔ درو دیوار۔ آسمان اور زمین۔ المختصر کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ راجہ کی تقدیر پر حسرت سے نظر ڈال رہا تھا۔ دونوں کی آنکھ سے آنسوؤں کی نہریاں بہہ رہی تھیں۔ سبز اوڑھنی کا سرا اندرا کے سر سے ڈھلک کر کاندھے پر آ پڑا تھا۔ حسن کی دیوی اس وقت محبت کی پوری تصویر۔ ہاتھ راجہ کے گلے میں تھے اور دل یادِ دلدار میں +

(۵)

ان خیالوں کو مدتیں ہوئیں وہ باتیں کہانیاں اور وہ راز و نیاز فسانے ہو گئے۔ آج جمنا کی لہریں راجہ کی موت کا نوحہ پڑھ رہی ہیں۔ شہر پر ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ عالی شان محلوں کے سر بفلک کنگرے اپنے مکین کے فراق ابدی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔ سدا بہار اور رنگ برنگ کے پھول جن کی خوشبو آسمان تک اُڑتی تھی پامال ہو گئے۔ اور وہ بار آور سر سبز ڈالیاں جن پر طائرانِ خوش الحان نغمہ سنجی کرتے تھے اندرا کی

بیوگی کا ماتم کر رہی ہیں۔ آدھی رات کا وقت ہے اور اندرا صرف ایک قمقمہ کی روشنی میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ راجہ کا صدمہ اس کے دل سے زائل ہو چکا۔ مگر خواب کی صورت وہ مستقل لگن ہے جو کسی طرح فراموش نہیں ہو سکتی۔ کلیجہ میں ہوک اٹھتی۔ دل میں نشتر چبھتے۔ حلق پر چھریاں چلتیں۔ مگر رات کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ دل بہت زیادہ تڑپتا تو اٹھ بیٹھتی ٹہلتی پھرتی۔ ادھر جاتی اُدھر جاتی۔ دیوانہ وار ایک ایک طرف جھانکتی اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ آسمان تاروں کا تھال لئے اندرا کے سر پر کھڑا تھا۔ کچھ دیر اس میں محو رہی اور دفعتہً چلا اُٹھی :۔

"چمکو۔ چمکو۔ آسمانی تارو۔ اندرا کے سر پر چمکو۔ اُڑو۔ اُڑو۔ ہوا کے جھونکو فضائے عالم میں اُڑو۔ اُڑو اور اندرا کی ہنسی اُڑاؤ۔ بھیگ بھیگ شب سیاہ! اچھی طرح بھیگ۔ اور اندرا بدنصیب کو۔ عرق ناامیدی میں بھگو۔ آ! آ! صبح قیامت آ! رات کا دامن اور اندرا کا سینہ چاک کرتا اُٹھا! اُٹھا۔ ظالم آسمان۔ اپنی کشش سے اندرا کو اُٹھا لے۔ جذب کر لے۔ غارت کر دے"۔

(۶)

اثر محبت کی قائل ایک دنیا اور کشش قلب کا معترف ایک عالم سہی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اندرا جیسی رانی جس نے دعوئے عشق میں راجہ جیسے عاشق زار کو قربان کیا۔ کامیاب نہ ہوتی۔ اندرا عشق زلیخا کی سچی مثال تھی جس طرح شاہد ناکامی نے زلیخا کو یوسف کے گلے لگا دیا۔ یقیناً اندرا اس محبوبا

کی محبوب ہوتی جس کو خواب میں دل دے بیٹھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود گو صورت سے آشنا تھی مگر نام و نشان سے مطلق بے خبر۔

ایک زمانہ اسی طرح گذرا۔ ہوا کے جھکڑ چل چل کر رُکے۔ باد صبا سر سرا سر سرا کر بند ہوئی۔ مینہ کی جھڑیاں برس برس کر تھمیں۔ اور خطرناک طوفان آ آ کر ٹلے۔ مگر نہ تھما تو اندرا کی آنکھ کا آنسو جس کو دنیا اندھیر اور شاہی محل مٹی کے ڈھیر تھے۔ رات کے سنسان وقت میں سر پر بجلی اور طوفان آنکھ کے سامنے جنگل اور بیابان۔ اندھیرا گھُپ در و دیوار چپ پتے بیہوش چڑیاں خاموش اور اندرا بدنصیب۔ یاد حبیب میں سرشار و مضطرب و بیقرار پھر رہی ہے۔ ایک رات تن تنہا۔ کنہیا کے خطرناک جنگل میں تھی کہ نیند نے غلبہ کیا۔ زمین نے میزبانی میں فرش خاکی بچھایا۔ دریا کے پانی نے ترانے سُنائے۔ ہوا نے لوری دی۔ اور کنہیا کی مہمان۔ اسی خارستان میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ لیٹنا تھا کہ آنکھ لگی۔ اور آنکھ کا لگنا تھا کہ ایک اَور ہی سماں آنکھ کے سامنے تھا۔

ملک نیا۔ لوگ انوکھے۔ صورتیں عجیب۔ پوشاک نرالی۔ وقت رات کا ہے۔ مگر اندرا آج چودھویں کے چاند کو مات کر رہی ہے۔ سر پر کارچوبی دوشالہ۔ گلے میں جواہر نگار مالا۔ گلاب کا پھول ہاتھ میں۔ سات سہیلیاں ساتھ میں۔ ایک عالم کے دلوں کو پامال کرتی چلی جا رہی ہے۔ وہ چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں کی رات پر دن صدقے ہو رہا تھا۔ جشن شاہی کی تیاریاں تھیں۔ اور ہزارہا بندگان خدا مسلح کھڑے تھے۔ اندرا کا

پہنچا تھا کہ خلقت جشن وجلوس سب بھول گئی۔ ایک چشم زدن میں کئی لاکھ نگاہوں نے اس کی سلامی ادا کی سیکڑوں دل پامال کرتی ہوئی۔ اندرا۔ قصر شاہی میں پہنچی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ولی عہد سلطنت کے دائیں ہاتھ پر وہ چاند چمک رہا ہے جس کی عاشق زار تھی۔ دل بے اختیار ہوگیا صبر کی دھجیاں اُڑنے لگیں۔ قریب تھا کہ دوڑ کر لپٹ جائے۔ شرم وحیا نے پاؤں پکڑے کھڑی ہوگئی مگر ششدر نگاہ اُس چہرہ پر تھی۔ جس کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ اور جام محبت سے لبریز دل چھلکنے والا تھا۔ کہ بادشاہ اور ولیعہد۔ مہمان اور میزبان ایک ایک کر کے رخصت ہوئے +

اب اس عالی شان محل میں اندرا اور مقصود کے سوا کوئی نہ تھا محبت بھری نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ دلوں کی کشش نے زور کیا اور اندرا کی آہِ رسا تاثیر لائی۔ چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ مقصود فرطِ محبت میں لپکا۔ گو ولی عہد کا لڑکا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندرا بھی مہارانی ہے۔ مگر رعبِ حسن تھا یا داب شاہی محبت کی زنجیروں میں آپڑی۔ بڑھا اور ہاتھ پکڑ لیا +

اندرا۔ اس مہمان نوازی کا شکریہ قبول فرمائیے +

مقصود۔ پیاری۔ میرا منہ نہیں کہ آپ کی تکلیف کا شکریہ ادا کرسکوں آئیے آئیے اس تخت پر آرام فرمائیے +

اندرا۔ میں خاک کی رہنے والی تخت شاہی کی قدر کیا جانوں۔ یہ خدا آپ کو نصیب کرے +

مقصود۔ خدارا مجھ پر ظلم نہ کیجئے۔ میرے پاس نہیں تو دوری سہی لیکن! انصاف اجازت دے تو قلبِ مضطرب پہ ہاتھ رکھ کر اتنا دیکھ لیجئے۔ کہ یہ حُسنِ خداداد مجھ پر کیا اثر کر گیا ۔

خوشا نصیب۔ اس مجھ جیسے انسان کے جو اس صورت کا پرستار اور اس نازک دل کا مختار ہو ۔

اندرا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ بلبل نے کنہیا کے جنگل میں صبح کا پیغام پہنچا دیا۔ آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا ۔

(۴)

چاند؟ نہیں پری؟ نہیں نہیں! حور؟ ہرگز نہیں۔ اندرا ایک پھول تھی۔ کیسا پھول؟ جس نے تمام دنیا کو مہکا دیا! جس کی خوشبو پورب سے پچھم اور اُتر سے دکن تک پہنچی۔ جس کی خوبصورتی کا شہرہ جس کے حُسن کی دھاک۔ ایک عالم میں پھیلی ۔

آفتاب کو نکلے مشکل سے دو گھڑیاں ہوئی ہوں گی۔ کہ قبیلہ لنگوہی کا مشہور سردار۔ صبح شام ایک کرتا ہُوا شاہجہان آباد پہنچا۔ اور جمنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ کیسی کیسی مشاطائیں جو آسمان میں تھگلی لگائیں زر و جواہر لٹا کر مہیا کیں۔ کہا جو کچھ کہہ سکتا تھا۔ اور کر ڈالا جو کچھ کر سکتا تھا لیکن عشق کا وہ طوق جو اندرا کے گلے میں خواب نے ڈالا اُتر نہ سکا۔ کوئی منّت کوئی ظلم۔ کوئی سختی ایسی نہ تھی جس سے کام نہ لیا ہو۔ ظالم محبّت کے بھیس میں نفس کا بندہ نکلا۔ اور لنگوہی خاندان کی عزت پر ایسا دھبہ لگایا

کہ تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اندرا کے حمایتی چُن چُن کر پکڑے اور وہ قدیم نمک حلال جو اس کی عزت کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے۔ دکھا دکھا کر مارا اور بتا بتا کر پیٹا مگر واہ ری مہارانی اندرا۔ استقلال کے پاؤں اپنی جگہ سے نہ ٹلے ؂

(۸)

زر۔ زمین۔ زن۔ کہتے ہیں کہ یہ تین چیزیں جھگڑے کی اصل اور فساد کی جڑ ہیں۔ سچ۔ جھوٹ خدا جانے۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ اندرا کو اُس کا حُسن مصیبت ہو گیا۔ ایک صورت اور سینکڑوں عاشق زار ایک انار اور صد بیمار۔ کس کس کو آغوش میں لے۔ اور کہاں کہاں دلداری کرے؟ خدا خدا کر کے راجہ کے قبضہ سے نکلی سمجھی تھی کہ اب باقی عمر اطمینان سے بسر ہو جائے گی۔ وصل نہ ہوگا تو فراق کی سختیاں تو ہوں گی۔ دُکھ بھرونگی مصیبتیں جھیلوں گی۔ رقیبوں کا کھٹکا اور ان آسمانی بلاؤں کا خوف تو نہ ہوگا۔ موت آئے گی مرجاؤں گی اور یہ کہتی ہوئی اُٹھوں گی ؎

حاصل عمر فدائے سر یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مگر افسوس اس ظالم نے وہ ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آگیا ؂

دوپہر ڈھل چکی تھی کہ قسائی چاروں طرف قتل عام کرتا ہوا اندرا کے محل میں گھسا۔ بدنصیب رانی کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ سوچتی تھی کہ اب عصمت کا خدا ہی حافظ ہے۔ مدتوں کے سورما اور وفادار جو حکم

پرتیار اور اشارے پر جان نثار کرنے کو موجود تھے۔ جانیں قربان کر گئے۔ کوئی بادشاہ نہیں حاکم نہیں کہ فریاد کروں اور جان بچاؤں۔ چھ سات میں چھ برس کا وہ پورہے۔ موذی نے اُسے کیا چھوڑا ہوگا۔ سبب فساد تو میں ہی ہوں۔ میری وجہ سے نہیں تو میرے سبب سے یہ ہزار لاشیں خون میں تڑپ رہی ہیں۔ اتنا کچھ دیکھ چکی اور کیا کیا دیکھوں گی۔ بس اس دنیا کو خیر باد کہوں۔ محل کے نیچے جمنا کس آن بان سے بہہ رہی ہے۔ اس کی لہریں گود پھیلا کر مجھے لیں گی اور یہی اکڑتا مچلتا پانی اس پیاری صورت تک یہ پیغام پہنچا دیگا کہ اندرا بدنصیب تجھ پر قربان ہو گئی۔ مگر دور کیوں جاؤں۔ کانوں کے آویزے چھنگلیا کی انگوٹھی سر کا سیس یہ تینوں ہیرے جو اب تک حسن کو ترقی دیتے رہے آج زائل کر دینے کو کافی ہیں۔

ابھی اس خیال کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ قزاق قصر شاہی میں گھس آئے۔ اور قتل عام کر دیا۔ سنگ کی سہیلیاں اور ساتھ کی کھیلیاں آنکھوں کے سامنے گئیں اور بھروسے کے نمک حلال دیکھتے دیکھتے خون میں نہا گئے۔ بیرحم جلاد نے اب خاص کمرے کا رُخ کیا۔ قدم دھرنا تھا کہ اس صورت سے چار آنکھیں ہوئیں جس کا شہرہ ہزاروں کوس کی منزل سے کھینچ کر لایا تھا۔

ماہ جبین اندرا اس وقت میلی کچیلی کرتی بکچی سی اوڑھنی اوڑھے تصویر کی طرح کھڑی تھی۔ مگر یہ موہنی صورت اس حالت میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ عزیزوں کے خون کے قطروں نے افشاں دے کر پیشانی کو جبین عروس کر رکھا تھا۔ سنگدل سردار نے ایک آہ سرد بھری اور ہائے

اندرا" کا نعرہ لگا کر بڑھا

قیامت خیز وقت تھا کہ اندرا جیسی نازنین کو بچاؤ کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مگر واہ رے حسن اور مرحبا رعب حسن اس موقع پر بھی وہ کام دیا کہ تیرو تفنگ سب رکھے کے رکھے رہ گئے۔ اندرا کا اتنا کہنا ایک بجلی تھی کہ ظالم کے دل پر اس طرح گری کہ جلا کر خاک کر دیا:-

"آیئے آیئے۔ اور اس شمسان محل کو رونق دیجئے"۔

اندرا جیسی دلربا کے لب لعلیں سے یہ الفاظ ایک جادو تھا کہ سردار کے اوپر پورا کارگر ہوا۔ اس کی صورت اور اپنی قسمت کا مقابلہ کرتا تھا۔ دل خوشی کے مارے ہاتھوں اچھل رہا تھا۔ اتنا کہہ کر پاؤں پر گر پڑا:-

"بیگم بہت روز تک مصیبت بھگتی۔ اب کچھ دن جوانی کے لطف دیکھو"۔

اندرا۔ (پاؤں سے سر اٹھا کر) آپ ایک قبیلہ کے سردار اور ایک ملک کے حاکم ہیں۔ سیکڑوں۔ ہزاروں لاکھوں رعیت آپ کے پاؤں پر سر رکھتی ہے۔ سر اٹھایئے اور میری عزت افزائی کیجئے۔

سردار۔ بیگم! کامل تین سال سے اس صورت کی شہرت نے دل تڑپا رکھا تھا۔ آج دیکھنی نصیب ہوئی۔ کیا میری تقدیر اس قابل ہے کہ آپ میرے ہمراہ میرے قیام گاہ پر تشریف لے چلیں۔

اندرا۔ یہ گھر بھی آپ کا اور وہ گھر بھی! مجھے لے چلئے یا خود تشریف لایئے بہتر ہوگا کہ مہمان نوازی کی عزت میں حاصل کروں اور اجازت دیجئے

کہ شام تک اس جھونپڑی کو آپ کے قابل بنانے کی کوشش کروں +
سردار۔ بیگم میں محل اور عزت کا طلبگار نہیں۔ صرف اس صورت کا بھوکا ہوں جس نے مجھ کو دیوانہ کر دیا۔ تعمیل میں عذر نہیں جاتا ہوں شام کو حاضر ہوں گا +

خدا کی شان جس زمین پر تمام دن خون کے دریا بہتے رہے۔ وہ رات کو نمونہ جنت بن گئی۔ اندرا کہنے کو تو عورت تھی۔ مگر مردوں سے زیادہ کام کر گئی اور اس حال میں کہ نوکر چاکر عزیز و اقارب سب لقمۂ اجل ہو چکے تھے۔ اس افراتفری اور غدر کے موقع پر چٹکی بجاتے میں محل دو محلے سب سجا لئے۔ آرام گاہ امر واقعی یہ ہے کہ جنت کو مات کر رہی تھی جلاجلی مسہری گنگا جمنی پردے سنہری ڈوریاں۔ روپہلی تکئے۔ موتیا کے گجرے چنبیلی کے کنٹھے۔ المختصر سردار لنگوہی کی آنکھیں بھی رانی اندرا کا ٹھاٹ دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سامان پر طرّہ اندرا کا اپنا دھانی لباس تھا ؎

کہے تو کہ شب چاندنے آن کے
نکالا ہے منہ کھیت سے دھان کے

سردار صورت دیکھتے ہی بے قرار ہو گیا۔ سامان مئے ناب موجود تھا۔ اندرا کے نازک ہاتھوں نے مہمان نوازی کی +

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی کہ ظالم سردار کے دستِ شوق آگے بڑھے اور ماہ جبین اندرا کو پہلو میں کھینچا +

تعجب ہوتا تھا کہ کس طرح قول کی پکی۔ بات کی پوری۔ دھن کی سچی اور

دل کی الجھی؟ اندرا ماہ جبیں اس ظالم کی مہمان نوازی کر رہی ہے۔ دفعتہً خنجر آبدار نازک ہاتھوں سے باہر نکلا اور چشم زدن میں سفاک سردار کی انتڑیاں باہر نکال کر پھینک دیں۔ اتنی آواز تو سنائی دی!

"اے ظالم دغا باز اس صورت پر یہ دھوکا"

(۹)

حُسن کا ڈنکا تو چار وانگ عالم میں بج ہی چکا تھا۔ اس سے ایک دنیا اندرا کی شجاعت کا لوہا مان گئی ۔

اب مجروح دلوں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اظہار محبت بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے۔ انداز دلربائی وہی اور موسم شباب بہار پر تھا۔ چشم کافر جدھر پڑتی تھی دل کے ٹکڑے اڑا کر رہتی تھی۔ ہزاروں فیدا پیدا ہوئے۔ مگر دل کا ارمان دل میں رہا۔ ایک روز شام کے وقت گرمی کے موسم میں نہا دھو کر محل کی تیسری منزل پر کھڑی ہوئی بال سُکھا رہی تھی۔ زلف شبگوں سے رنگ برنگ کے موتی ٹپک رہے تھے کہ ایک زابلتانی مصور اُدھر سے نکلا اندرا کو علم تک نہ ہوا اور مصور تصویر لے سیتان روانہ ہوگیا۔

یہ تصویر صحیفۂ قدرت کا ایک ورق تھا جس میں صناع حقیقی نے اپنے ہاتھ سے گلکاری کی تھی۔ زلف شبگوں افعی کی طرح لہراتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھی۔ اور دست سیمیں کی تین انگلیاں اس سانپ کو کھلا رہی تھیں۔ ایک نیستان و زابلتان کیا تمام فارس لٹو ہوگیا۔ مگر لنگوہی سردار کا انجام سُن کر کس کی ہمت تھی کہ ادھر کا رُخ کرتا؟ ہاں وزیر جنگ کا لڑکا نادر الدولہ

جان پر کھیل گیا۔ اور دن رات ایک کرتا ہُوا دلی پہنچا۔ اور کامل تین روز وہ قتل عام کیا کہ آسمان اور زمین دونوں چلا اُٹھے۔ لنگو ہی مظالم از سر نو زندہ کر دیئے +

ہم اتنا مان لینے کو تیار ہیں کہ جس وقت زابلتانی شجاع اس ماہ جبین کو بارگاہ شاہی میں لائے ہیں اور نادر الدولہ اس کے آغوش میں سر رکھے لیٹا ہے تو چشم سیاہ سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مگر یقیناً ہم زابلتانیوں کے اس دعوے کو صحیح نہیں مانتے کہ اندرا اُنکے وزیر زادے کو دل بیٹھی۔ مانا کہ ہزار دو ہزار میں ایک دیکھنے دکھانے کے لایق حسین و شکیل طرحدار و وضعدار سب کچھ تھا۔ مگر اندرا کے دل کو کچھ اور ہی لَو لگی ہوئی تھی۔ یہ آنسو محبّت کے نہیں رنج اور صدمے کے تھے جو مقصود کے فراق میں اندرا کی آنکھ سے نکلے اور وزیرزادے کے رخسار پر گرے واقعات آنکھ کے سامنے ہیں۔ معاملات کی شہادت پر زابلتانی ہوں یا ہندوستانی صائب الرائے خود ہی فیصلہ کر لیں +

نادر الدولہ جب ہر کوشش میں ناکام رہا اور یہ یقین کر لیا کہ مواصلت کی اُمید مطلق خبط ہے۔ اندرا خودکشی پر آمادہ ہے۔ تو اسی شخص نے جو عشق کا مدعی تھا۔ اس کے تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ یہ اندرا کی خوش نصیبی ہے کہ وزیر زادہ عصمت سے نا اُمید ہو کر زر و جواہر کے پیچھے پڑا۔ اور اندرا غریب کو لوٹ کھسوٹ کر کے چلتا ہُوا +

(۱۰)

لیلیٰ کا شیدائی مجنوں ۔ شیریں کا فدائی فرہاد ۔ مگر اندرا کے گھائل ہزاروں اور لاکھوں ہندو مسلمان عیسائی ۔ ہر قوم میں اس کے عاشق اور ہر ملک میں اس کے طلبگار پیدا ہوئے اور اپنی اپنی جگہ اپنی کرنی میں کسی نے کسر نہ کی ۔ ان دو ظالموں سے چھٹکارا ہوا تو مرہٹوں نے ڈورے ڈالے ایک شقی القلب تو دن دہاڑے گھر میں گھس آیا اور ایسے ڈیرے ڈالے کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیا ۔ نت نئے سوانگ بناتا اور طرح طرح کی چالیں چلتا ۔ کامیابی کی کوشش ہاتھ سے نہ دی ۔ ظلم کئے تو وہ حد کے مکاری کی تو وہ پوری ۔ لیکن سچی محبت کا گھائل ۔ وہ اچھا دل جو اندرا پہلو میں رکھتی تھی کسی طرح نہ پسیجا ۔ اور جو جس راستہ آیا اسی راستہ چلتا ہوا +

پڑھنے والو ! فراق کی سختیاں ختم ہوئیں ۔ داستان مصیبت سُن لی ۔ شب وصل کے مزے بھی لوٹ لو ۔ ۷ ر دسمبر ۱۹۱۱ء کی صبح ہے اور آج ماہ جبین اندرا نک سے سک نہا دھو پہن اوڑھ انتظار یار میں گھڑیاں گن رہی ہے ۔ زیور سے لدی ۔ پھولوں میں لسی ۔ عطر میں ڈوبی ۔ وہ حسن کی پوٹ جس نے ہزاروں کے دل لوٹ پوٹ کئے ۔ جھروکوں میں بیٹھی دریا کے اُس پار دیکھ رہی ہے ۔ آسمان اس کے استقلال و صداقت پر لطافت کے پھول نچھاور کر رہا ہے ۔ قلعہ معلیٰ کے در و دیوار اس کے انتظار میں شریک ہیں ۔ اور جمنا اس کی کامیابی پر مبارکباد کے نعرے لگا رہی ہے ۔ مشرقی میدانوں سے آفتاب عالمتاب کے بلند ہوتے ہی ثابت قدمی کے مبارک فرشتے

آسمان محبت سے نیچے آئے خلوص کی کشتی عصمت کے خلعت فاخرہ سے جھلمل جھلمل کرتی ہاتھ میں تھی۔ اور وفاداری کے گجرے ارمانوں کی ہوا میں مہک رہے تھے ٭

خوشا نصیب! سرزمین شاہجہان آباد! ایک اندرا کی بدولت تیری شان و شوکت کا ڈنکا روئے زمین پر بج گیا۔ کفرانِ نعمت گناہ کبیرہ ہے۔ اسی کا طفیل ہے کہ جمنا کا وہ کنارہ جو ببول کے کانٹوں سے پٹا پڑا تھا۔ آج گلاب کے پھول گود میں لئے کھڑا ہے۔ بیلے جیسے خارستان... کوٹلے جیسے بیابان۔ اسی کے صدقہ میں چمنستان ہو گئے۔ شاہجہان آباد اگر تیرے کھنڈر اِن خزانوں سے مالا مال تھے جن کا اب دنیائے ادب میں کال پڑ گیا تو تیرے باغیچے آج ان رنگ برنگ کے پھولوں سے شاداب ہیں۔ جن کی مہکار آسمان تک پہنچ رہی ہے۔ شاہجہان آباد انصاف کی آنکھیں کھول تعصب کی عینک دور کر۔ اور تامل کی نظر سے دیکھ۔ اسی سہانی صبح کو نورانی فرشتے تیرے اجڑے ہوئے گلشن میں نازل ہو رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ شاہجہان آباد دیکھ۔ تیری نازوں کی پلی ماہ جبین اندرا کی بارگاہ آج محبت کے فرشتوں کی سجدہ گاہ ہے۔ دونوں فرشتے جھک گئے۔ آگے بڑھے۔ اور اپنے ہاتھ سے اندرا کو دلھن بنایا ٭

(۱۱)

۷ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ٹھیک گیارہ بجے جب شہنشاہ معظم نے سلیم گڑھ اسٹیشن سے اتر کر قلعہ معلیٰ میں قدم رکھا ہے۔ دلی کی سرزمین خوشی کے

مارے اُچھل پڑی اور یہ آواز سُنائی دی ؛

"میں اندرا نہیں" "اندر پرستھ" "اندر پرستھ" نہیں "شاہجہان آباد" "شاہجہان آباد" نہیں دِلّی ہوں۔ وہ جوگی راجہ یدھشٹر لنگوہی کا سردار تیمور۔ وزیر نادہ نادر اور مرہٹہ سیواجی تھا۔ جنہوں نے مجھے لوٹ مار کر برباد کیا۔ اور آج یہ مبارک قدم میرے محبوب کے ہیں جس کو خواب میں دیکھا تھا ؛

آج میرا مطلوب ایک عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ ہے۔ قدم میرے سر اور آنکھوں پر۔ ہیں میں اندرا نہیں اندر پرستھ ہوں ؛

"خدا میرے شہنشاہ کی عمر دراز کرے"!

ساون کی چڑیاں

برسات کے دن بھی عجب بہار کے دن ہوتے ہیں جہاں دو چھینٹے پڑے اور ہر چیز پر ایک رونق آ گئی۔ گھر کے در و دیوار تک جو پورے برس بھر گرد و غبار میں اٹے رہے۔ دُھل دُھلا صاف شفاف ستھرے اُجلے دکھائی دینے لگے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ پپیہا بول رہا ہے۔ مور جھنکار رہا ہے۔ ٹیٹری الاپ رہی ہے۔ کڑھائیاں چڑھ رہی ہیں۔ جھولے پڑ رہے ہیں۔ کھم گڑ رہے ہیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ غرض جنگل ہو یا گھر ہر جگہ اس کے آنے کی خوشیاں منائی جاتی ہیں جن درختوں کو پت جھڑ نے ٹھنڈ بنا دیا تھا۔ برسات شروع ہوتے ہی ہری ہری کونپلوں سے مالا مال ہو گئے جنگل میں لمبی لمبی گھاس لہرانے لگی۔ باغوں میں ہریاول نے سکہ جما دیا جن کھیتوں میں گرمی بھر ٹخنوں ٹخنوں مٹی تھی وہاں قد آدم اناج کے درخت کھڑے ہو گئے ساون کے مہینے میں جب یہ درخت لدے پھندے ہوتے ہیں تو بہت سی چڑیاں اپنا پیٹ بھرنے آ جاتی ہیں۔ لیکن جہاں ساون ختم ہوا اناج کٹنے کی نوبت آئی اور یہ چڑیاں پھر پھر اُڑنی شروع ہوئیں ؛

میں نیں یہی حال ہماری لڑکیوں کا ہے۔ کہ ساون کی طرح کوارپتے کے دن میکے میں بسر کر رہی ہیں۔ بڑی ہوئیں بات ٹھہری شادی ہوئی اور یہ جادہ جا

منڈھا جو بیٹی کی وداع کے وقت میراثنیں گاتی ہیں اُس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ بیٹی باپ سے کہتی ہے:

بیرن کو دینی بابل اونچی رائے اٹریا ہم کو چھایا پردیس رے
ہم تو رے بابل ساون کی چڑیاں چگلیں اُڑ جائیں رے
دِہلیاں پربت بھئیں۔ بابل انگنا بھئیو بدیس رے
لے بابل گھر اپنا ہم چلے پیا کے دیس رے

اے باپ! بھائی کے واسطے اونچا دو منزلہ تیار کیا۔ اور ہم کو پردیس پہنچایا۔ اے باپ ہم تو ساون کی چڑیاں ہیں۔ جب تک تقدیر میں دانہ پانی ہے تیرے ہاں کھا پی لیں اور چگ چگا کر اُڑ جائیں۔ اے باپ آج تیرا دروازہ ہمارے واسطے اونچا پہاڑ ہو گیا۔ اور تیرے گھر کی انگنائی ہم کو پردیس ہو گئی۔ لے اپنا گھر تجھے مبارک ہو۔ ہم اپنے خاوند کے گھر رخصت ہوئے۔

ذرا غور کرنے سے ماں باپوں کا دل آپ ہی گواہی دے گا۔ کہ یہ معصوم بچیاں ہمارے ہاں چند روز کی مہمان ہیں۔ پھر نہ معلوم ان کی تقدیر ان کو کیا دکھائے۔ یہ کس بیدرد کے پالے پڑیں۔ دُنیا کی بہار ان کی تقدیر میں ہو یا نہ ہو۔ ان کو زندگی عزیز ہو۔ یا ظلم سہتے سہتے اور مصیبتیں بھگتتے بھگتتے جینا وبال جان ہو جائے۔ ان کی بے فکری کا زمانہ اور آزادی کا وقت یہی دن ہیں جو میکے میں گزر گئے۔ لیکن یہ زمانہ بھی اگر اُن کا رنج اور کوفت میں گزرا تو ان کے برابر دنیا میں کوئی بدنصیب نہیں۔

قدرت نے ان کو اس غرض سے پیدا کیا تھا کہ یہ بڑی ہو کر ایک خاندان پر حکومت کریں۔ لیکن ہم نے ان کو محکوم ہی بنا کر بس نہیں کی۔ ان کی آزادی چھینی۔ ان کے حق مارے۔ اور اگر لونڈیوں سے بدتر نہیں تو لونڈیوں کے برابر بنادیا +

سُنا ہے اگلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ بیٹی کو زندہ دفن کر دیتے۔ یا کنوئیں میں پھینک دیتے تھے۔ یہ دستور کچھ حکومت کا ڈر کچھ علم کا اثر اب بند ہو گیا۔ مگر اُس وقت میں اور اس وقت میں فرق یہ ہے کہ جب زندگی کا خاتمہ تکلیفوں کو ختم کر دیتا تھا۔ اور اب اگر تمام عمر نہیں تو کوارپتے کے دن اکثر تکلیف میں بسر ہوتے ہیں +

جن خاندانوں میں تہذیب اور علم کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ اُن میں بھی مَیں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلہ میں کوئی نہیں پوچھتا۔ روزمرہ کی زندگی میں جیسی خاطر و مدارات بیٹوں کی ہوتی ہے بیٹیوں کی نہیں ہوتی۔ جس قدر صرف لڑکے پر ہوتا ہے لڑکی پر نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی کوئی اچھی چیز موجود ہوئی تو ماں نے بیٹوں کو دے دی۔ اور بیٹیوں کو یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ تمہیں کچھ اَور دے دینگے۔ اور یہ معصوم معصوم بچیاں دل مار کر بیٹھ گئیں +

کپڑے اپنی اپنی حیثیت کے موافق جیسے لڑکوں کے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے نہیں ہوتے۔ کھانا جیسا لڑکوں کو ملتا ہے۔ لڑکیوں کو نہیں ملتا۔ غرض جو عزت اور محبت بیٹوں کی ہوتی ہے بیٹیوں کی نہیں ہوتی +

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بدنصیب لڑکیاں کیا دل نہیں رکھتیں ؟ کیا ان کے مُنہ پر آنکھیں نہیں ہیں ؟ کیا یہ ماں باپ کے اس برتاؤ کو نہیں سمجھتیں؟ بیٹا بیٹی والی ماؤں ! انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا۔ سوچو اور بتاؤ ان بیچاریوں کا دل اُس وقت کیا کٹتا ہوگا۔ جب یہ دیکھتی ہوں گی کہ روغنی روٹیاں۔ تر بتر پراٹھے بھائیوں کو مل رہے ہیں اور بچا بچایا ان کو ؟ مرد اس معاملہ میں گنہگار نہیں۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ گھر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم بھی ان کے دل نہ رکھو گی تو تم سے زیادہ شفیق ان کو کون ملیگا؟ یہ تمہارے پاس سدا رہنے والی نہیں۔ اَور چند روز کی مہمان ہیں۔ یہ ایسی جائیں گی کہ ان کی صورتوں کو ترسو گی۔ تمہارے گلے میں نوالے اٹکیں گے اور ان کو نہ کھلا سکو گی۔ یہ تم سے سیکڑوں ہزاروں کوس دور ہوں گی۔ تم اس وقت منگانا۔ پکانا۔ کھانا کھلانا۔ یہ تم سے حصہ لینے نہ آئیں گی۔ تمہارے بیٹے تم کو مبارک۔ بہوئیں لائی نصیب۔ تمہارا اُن کا عمر بھر کا ساتھ ہے۔ مگر ان کا تمہارا ساتھ اَور کچھ روز ہے +

آیندہ کی خبر تو بیٹوں کی بھی نہیں۔ مگر وہ کسی کا ہاتھ تکنے والے نہ ہونگے۔ یہ ایک ایسے شخص کے بس میں ہوں گی جو اپنی مرضی پر چلائیگا اپنے حکم پر اُٹھائیگا۔ اور اپنی ہول پر بٹھائے گا۔ یہ ایسے پنجرے میں قید ہونگی۔ جہاں کوئی ان کا حمایتی نہ ہوگا۔ یہ بے فکری کی نیند اسی وقت تک ہے جب تک تمہارے گھر پر ہیں۔ یہ اطمینان۔ یہ کھیل کود تمہارے ہی در پر چھوٹ جائیں گی جس وقت دوسرے گھر میں جا داخل ہوئیں چاروں طرف کے

نگران کے سر پر سوار ہوں گے اور یہ دھاڑے کی سونے والیاں چار بجے سے اُٹھ کر پانی گرم کریں گی +

کیوں بیٹی والیو! جس وقت تم لڑکوں کی غلط حمایت لے کر جھڑکتی ہو ان کو مارتی ہو۔ اور یہ بیگناہ حسرت سے تمہارا منہ تک کر چپکی ہو جاتی ہیں اس وقت ان کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ اگر میکے میں بھی اُنہوں نے چین نہ کیا تو سسرال جا کر کچھ تم نے کیا ہو گا۔ کچھ یہ کریں گی +

بعض مسلمان ماؤں کا خیال ہے کہ جب اللہ ہی نے اُن کے حق آدھے کر دیئے تو پھر ہم کیوں نہ کریں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ خدا نے بیٹیوں کے حق اگر آدھے کئے ہیں تو ماں باپ کے بعد۔ جیتے جی نہیں اور وہ بھی اس لئے کہ آٹھواں حصہ اِدھر اُدھر لگا دیا ہے +

مسلمانوں میں بہت کم خاندان ایسے ہوں گے۔ اور تعجب نہیں کہ بالکل ہی نہ ہوں۔ جہاں لڑکیوں کی پرورش اسی طرح کی جاتی ہو جس طرح لڑکوں کی۔ اس اعتراض پر کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اکثر مائیں کہتی ہیں کہ اُن کے دینے کا وقت ایک ہی ایسا چلا آ رہا ہے۔ کہ یہ گھر کی جھاڑو تک سمیٹ کر لے جائیں گی۔ لیکن کیا کوئی ایسی مثال بتا سکتا ہے کہ بیٹی کے بیاہ پر ایک ماں نے دو ہزار اُٹھائے اور بیٹے کے وقت دو سو بھی نہ جُڑے؟ جو ماں باپ بیٹی کا بیاہ دو ہزار میں کرنے کی توفیق رکھتے ہیں اور کرتے ہیں۔ وہ بیٹے کا بھی اس سے کم میں نہیں کرتے پھر کیا وجہ ہے کہ بیٹے تو چمکتے ہوئے لال کہلائیں اور بیٹیاں بھاری پتھر؟ سچ پوچھو تو بیٹیاں کوارپنے میں بڑوں

سے زیادہ شفقت کی محتاج ہیں۔ لڑکے جوان ہو کر ہر وقت کسی کی رعایت کے
محتاج نہ ہوں گے۔ لیکن یہ بے بس بچیاں ہر حال میں دوسرے کی عنایت
اور محبت کی محتاج ہوں گی۔ اور ان کے ساتھ کوئی رعایت کرنے والا نہ ہوگا۔
اطاعت کریں گی اور پیٹ پالیں گی۔ وہ بھی اگر کسی معقول کے پالے پڑ گئیں
جو کہیں تقدیر نے کسی نامعقول کے ہاں دھکیل دیا تو وہ خدمت اور اطاعت کا
بدلہ تو الگ سا رہا یہ بھی نہ دیکھے گا کہ اس کمبخت نے صبح سے شام تک کیا کیا اور
کیا کر رہی ہے۔ کیا اتنا تک پوچھنے والا نہ ہوگا کہ اس بدنصیب پر کیا گزر گئی +
ایک اور بات دیکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ جو محبت اور اُنس بیٹیوں میں
ہے وہ بیٹوں میں نہیں۔ صاحبزادوں کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی
اور وہ شیر کی طرح غرّا کر آئے۔ یہ بے زبان بچیاں اگر کھسیانی بھی ہوئیں تو
منہ سر لپیٹ کر پڑ رہیں۔ رو دھو کر چپکی ہو گئیں +

کون سی عقل اور کونسا انصاف ہے جس نے لڑکوں کو عزیز اور لڑکیوں
کو ذلیل بنا دیا؟ اگر ان مظلوموں سے اتنا بھی سلوک کیا جائے جتنی یہ
خدمت کرتی ہیں۔ تو بھی لڑکوں سے اچھی پڑ رہیں گی۔ سینا پرونا کھانا پکانا
کونسا کام ہے جس میں یہ بیچاریاں ماؤں کو مدد نہیں دیتیں؟ بہن بھائیوں
کو پالیں۔ اماں باوا کی خدمت کریں۔ غرض صبح سے شام تک کسی وقت خالی
بیٹھنا نصیب نہ ہو۔ اس پر ان کی یہ قدر کہ "ماں کے گھر بیٹی گو در لپیٹی"+
خدا کو خدا حشر کو حشر سمجھنے والی مائیں یقین کر لیں کہ جس روز وہ
ایک زبردست بادشاہ کے حضور میں کھڑی ہونگی اُس وقت اُن کو جواب

دینا ہے کہ ان بے داموں کی لونڈیوں اور مفت کی باندیوں کی کس قصور
اور کونسی خطا میں ایسی بے قدری کی؟ یہ اپنی پرورش میں تمہاری محبت
کی اتنی ہی محتاج تھیں جتنے لڑکے۔ وہ مائیں جو آج بیٹے اور بیٹیوں میں
فرق کر رہی ہیں اس کا جواب سوچ لیں۔ ورنہ اس نازک اور انصاف
والے میدان میں اس کا بدلہ بھگتنا پڑیگا ؎

اُمید اور نہ صرف اُمید بلکہ یقین ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے والی مائیں
کسی فرصت کے وقت میں اس معاملہ پر غور کرینگی۔ وہ شروع سے آخر
تک نظر ڈالینگی تو اُن کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ پہلی بے انصافی
تو لڑکیوں کے ساتھ یہ ہوئی کہ پیدا ہوتے ہی گھر بھر میں سناٹا چھا گیا۔
اُنھوں نے اپنی میٹھی اور بھولی بھالی باتوں سے دل میں گھر کیا۔ سیانی
ہوئیں تو اور سہم چڑھا۔ مگر یہ اپنی خدمت اور اطاعت سے ساتھ ہی لگی لپٹی
رہیں تم ان کو پرائے گھر کا کوڑا کہو اور یہ تمہارے سر میں درد سن لیں تو سو
کام چھوڑ چھاڑ تمہارا سر دبانے آ بیٹھیں۔ بساط کے مطابق بوجھ ڈھوئیں۔
عمر کے لائق خدمت کریں۔ تم سو کر اُٹھو یہ گھر کو چندن کر کے رکھ دیں۔ سالو
تمہارے ساتھ جاگیں۔ دنوں تمہارے پاس کام کریں۔ بہنوں کو بہلائیں
بھائیوں کو کھلائیں۔ سی کر پہنائیں۔ پکا کر کھلائیں۔ ان کی خدمت اور
محبت کا یہی بدلا ہے کہ تم ان کی بات تک نہ پوچھو؟ باپ کی خدمت کو
یہ حاضر ماں کی مدد کو یہ موجود، تمہاری آنکھ میلی ہو اور ان کی آنکھ میں آنسو
آجائیں۔ تم ان سے بیزار یہ تم پہ پروانہ۔ تم ان سے بھاگو۔ یہ تم سے لپٹیں۔ ان پر

نہیں۔ تو ان کی مجبوری پر رحم کرو جس کے ہاتھ میں پکڑا دو انہیں عذر نہیں رہیں تو راضی، چلیں تو خوش +

جس طرح مصیبت بھری دنیا تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اسی طرح ان کے سامنے ہو گی!! ان کو ان جھگڑوں سے الگ تھلگ سمجھو تو اسی وقت تک جبتک تمہارے در پر بیٹھی ہیں۔ یہ تھوڑے سے دن پل مارتے بسر ہونگے۔ اور وہ وقت آن پہنچے گا۔ جب تم انہیں اپنے گھر سے رخصت کرو گی۔ تمہارے گھر کا ایک ایک کونہ ان پر روئے گا جن چیزوں کو آج یہ اپنا سمجھ رہی ہیں۔ یہ اُن سے چھوٹیں گی۔ یہ دن پھر ہاتھ نہ آئینگے۔ اور جب یہ مہمانی ختم ہو گئی۔ تو پھر یہ دوسروں کے قبضہ میں ہوں گی۔ میکے سے بھی اگر خوش نہ گئیں تو انہوں نے دنیا کا کیا دیکھا؟ بیٹی والیو! وقت کو جاتے دیر نہیں لگتی۔ یہ ہی چار چار پانچ پانچ برس کی مینائیں جو آج باتیں ملکاتی پھرتی ہیں۔ ان کی پالکیاں آن لگیں۔ اٹھو انہیں سوار کراؤ۔ سنو یہ کیا کہہ رہی ہیں اور سوچو کہ سچ ہے یا غلط :-

کچھ عرض کرنے ماؤں سے — آئی ہیں یہ دکھیاریاں
صورت سے ظاہر بےکسی — چہرے سے حسرت ہے عیاں
جس حال میں رکھا رہے — ہم نے نہ کی زنہار اُف
رکھی ہو آدھی بات گر — مُنہ پر تو کٹ جائے زباں
جو آگیا وہ لے لیا — جو دے دیا وہ کھا لیا
جب نیند آئی پڑ رہے — ہم نے جگہ پائی جہاں

شرم و حیا عادت رہی — صبر و رضا شیوہ رہا
مُنہ تک کے چپکے ہو گئے — بے وجہ کھائیں گھڑکیاں
گو بھائیوں کے ہاتھ سے — پِٹتے رہے کُٹتے رہے
اتنی نہ تھی ہمت مگر — کرتے کبھی تم سے بیاں
اب ظلم کی حد ہو چکی — انسان ہیں آخر کو ہم
گو مُنہ سے ہم خاموش ہیں — دل سے نکلتا ہے دھواں
کُنبہ کی طاعت ہم نے کی — گھر بھر کی خدمت ہم نے کی
تم چین سے سوتیں اور ہم — بہنوں کو دیتے لوریاں

بیٹے مبارک ہوں تمہیں مہمان کو رخصت کرو۔

وہ وقت آخر ہو چکا اب ہم کہاں اور تم کہاں؟

اب ہم کو دنیا ہے نئی — دانا نیا پانی نیا
جانا ہے ایسے دیس میں — پردیس سے جو ہے سوا
چلنا ہزاروں کوس ہے — رستہ کٹھن منزل کڑی
چاروں طرف سنسان ہے — اور سر پہ بادل چھا گیا
دم بھر میں طعنوں سے کریں — چھلنی کلیجہ گود کر
پتھر سے بدتر جن کے دل — ان سے ہمیں پالا پڑا
کھنکیں نپھانسیں ساس کی — ہنس ہنس کے ہم باتیں سُنیں
اگر بڑوں کی لاج کا — ٹھیرا ہے اس پر فیصلہ
فاقوں پہ فاقے ہوں اگر — رہنے کو چھپر ہو نہ در

ہو تنگ دستی یہ مفلسی — آئے نہ مُنہ پر کچھ گِلا
جو ظلم ہو سہ لیں اُسے — جو آپڑے جھیلیں اُسے
جب مِٹ کے ہم ہوں خاک تب — تم کو بنائیں کیمیا

شاباش کیا انصاف ہے. صد آفریں کیا داد ہے
اس پر بھی بیٹی بیاہی کو داخل پڑوسن ہی کہا!

غیروں کے جائے اور ہم — اب گھر پرائے اور ہم
ننھی سی جاں دُکھ سیکڑوں — سودا ہزار اور ایک سر
سُکھ چین کے دن ہو چکے — بے فکر نیندیں سو چکے
دن عیش کا شام ہو گیا — آنے لگے تارے نظر
نکلا لڑکپن بے وفا — میکا فقط تھی اک سرا
آخر جرس بجنے لگا — اور آگیا وقتِ سفر
شفقت بھری باتیں کہاں؟ — وہ دن کہاں راتیں کہاں؟
بابا ما کا بچھوا خواب تھا — جو آگیا اوّل نظر
آپہنچی در پر پالکی — قسمت ہے چودہ سال کی
مل کر گلے رخصت کرو — ہونے لگی ہے دوپہر
وہ میٹھے چاول اور کڑھی — باتیں ہیں سب دل میں گڑی
فریاد ہے دل میں بڑی — آتی نہیں لب پر مگر

دشمن تھی بھائی جان کی، جھوٹی تھی بے ایمان تھی
قربان اپنی ماں کے میں. لونڈی میں امّاں جان تھی

بدنصیب کا لال

مصیبت کا زمانہ۔ پریشانی کے دن۔ رات کا وقت۔ برسات کا موسم
مفلسی بےکسی۔ بےبسی۔ کس کس کا رونا رویا جائے؟ ماں باپ بھائی بند۔
دیور جیٹھ۔ ساس نند۔ کچھ مر کر چھوٹے۔ کچھ جیتے جی چھوٹے۔ دو دن کی بیاہی
چوتھی کھیل سسرال آئی۔ رستے میں ہی تھی کہ ماں کو بخار چڑھا۔ اور ایسی
گھڑی کا چڑھا کہ جان ہی لے کے ٹلا! لے دیکر ایک یہ سہارا تھا وہ بھی نہ رہا۔
چوتھی کی دلہن گم نخم سسرال سے چلی اور روتی پیٹتی میکے آئی صبح کو
پھول ہوئے۔ گھر میں مہمان بھرے تھے۔ باہر ابا جان کا نکاح ہو رہا تھا۔
قصہ مختصر اماں یوں گئیں۔ ابا یوں گئے! اور کوئی اوّل تو تھا ہی نہیں اور
جو تھیں بھی تو ایک رشتے کی نانی۔ وہ آپ جٹھانی کے ٹکڑوں پر تھیں۔ ساٹھ
پینسٹھ برس کی بڑھیا پھوس۔ بہری بھچنڈ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔
بات کی نہ چیت کی۔ کام کی نہ کاج کی۔ ہونا نہ ہونا دونوں یکساں۔

بھائی جس کے دم سے میکا ہے۔ بدنصیب دلہن کا کوئی نہ تھا انہیں کہنے
کو تو ماشاءاللہ ایک چھوڑ دو دو۔ مگر دونوں اپنے اپنے گھر بار کی۔ ایک خوشحال۔
وہ پردیس۔ دوسری شہر میں وہ کنگال۔ اور کنگال بھی کیسی کہ اناج تک کو
محتاج۔ غرض میکے میں تو نہ کوئی نام لیوا۔ نہ کوئی پانی دیوا۔ لے دے کے ایک

باپ کا دم سمجھ لو۔ وہ کہیں بیٹی کل کی مرتی آج ہی مرجائے۔ رہیں سوتیلی اماں وہ ایک دفعہ کیا کئی دفعہ اور اپنوں ہی نہیں محلے والوں تک کے آگے اور چوری چھپے نہیں ہانکے پکارے اور کھلے خزانے کہتیں زندہ کو روتی کیسی۔ الٰہی [illegible] کفن بھی میسر نہ ہو ٭

ساس جب تک زندہ رہیں بہو کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی رہیں۔ امیری نہیں غریبی اور غریبی کیسی کہ فقیری چھ ساڑھے چھ روپیہ کی آمدنی۔ خرچ پورا۔ کال پڑا ہوا۔ مگر صبح کا ناشتہ مرتے دم تک ناغہ نہ کیا! وہ جیتی ہوتیں تو حمیدہ کو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ پیٹ بھر کر نہ ہوتی آدھا پیٹ! سالن نہ سہی روکھی۔ روکھی نہ ہوتی سوکھی! دو وقت نہیں ایک وقت! تازی نہیں باسی! گھر کی نہیں بازار کی! بازار کی نہیں محلہ کی! غرض پوری آدھی! اونی پونی! اچھی بری لشتم پشتم۔ کسی نہ کسی طرح پیٹ میں پڑجاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ صاف تین وقت کا کڑاکا گزر گیا اور چوتھے وقت بھی اللہ ہی اللہ ہے ٭

ساس کا مرنا بہو کے سر پر دنیا بھر کی تکلیفوں کا دھرنا تھا۔ کچھ ایسی ہوا چلی اور ایسا نصیبہ پھوٹا کہ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ برس کے اندر ہی اندر گھر بھر کی صفائی ہوگئی! میراں جی میں ساس۔ مارہیں دونوں نند یں رجب میں۔ غرض تین تیسنے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے ساری کائنات دو باپ بیٹے باقی رہے۔ شبرات کا چاند ایسا بھاگوان آیا کہ ابا جان بھی چل بسے۔ ٹٹر دوں ٹوں ایک میاں ہی میاں رہ گئے۔ پانچ روپیہ باپ کی پنشن کے تھے۔ وہ بند ہوئے۔ ایک روپیہ ماں کے دم تک تھا۔

وہ بھی ختم ہوا۔ آٹھ آنے چاہے کھاؤ۔ چاہے پیو۔ چاہے اوڑھو۔ چاہو بچھاؤ۔
کچھ دن یوں بھی گزرے۔ مگر کہاں تک اور کب تک؟ کچھ نہ ہو تو دو میاں
بیوی ایک سیر بھر آٹا روز تو ہو۔ مگر کہاں سے؟ بیوی معذور۔ میاں مجبور۔
اُس پر طرہ یہ کہ اِدھر آیا زچہ خانہ اُدھر آیا رمضان۔ دونوں کے چھکے چھوٹ
گئے۔ زچہ خانہ کا تو ایک بہانہ تھا۔ دلوں میں غبار بھرے ہوئے تھے۔ میاں
بیوی کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ بیوی میاں کو دیکھ دیکھ کر جلتی تھیں۔ اٹھائیسواں
روزہ ہوگا چار بجے کے قریب بیوی کو بخار چڑھا۔ میاں سے کہنے لگی:۔

"ایک روزہ اور رہ گیا ہے۔ اللہ یہ بھی پورا کروادے!"

میاں۔ ایک ہو یا دو۔ میں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر رہا میرا ہی
دل جانتا ہے۔ اماں جان کے سامنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے۔
اب کے ایک پہلا اور ایک منجھلا کل دو ہوئے! کیا کھا کے رکھوں۔ اور کیا
دیکھ کے کھولوں +

بیوی۔ مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خبر نہیں۔ اگلے برس تو تم نے ایک بھی
نہیں رکھا۔ تم کیا اللہ بخشے خود آبا جان ہی گنڈے دار رکھتے تھے۔ گھر بھر میں
ایک اماں جان البتہ روزے کی پابند تھیں۔ باقی تو سب چھوٹے اور بڑے
دن دہاڑے دھڑلے سے کھاتے تھے +

میاں۔ تم ایسی بیہودہ باتیں کیوں کرتی ہو؟ پندرہ دن کی بیاہی چالوں
کی دُلہن تم کو کیا معلوم کس کا روزہ ہے۔ کس کو نہیں؟ جو دل میں آیا کہہ دیا
جو منہ میں آیا بک دیا۔ رو میں آئیں تو چھوٹے بڑے۔ مردہ زندہ سب

کو اُگھاڑ پھینکا +
بیوی۔ سبحان اللہ! دُلہن تھی اندھی تو نہ تھی! مُنہ پر گھونگٹ تھا یا کانوں میں ٹینٹیاں! دیکھتی نہ تھی سُنتی تو تھی! پکتا تھا۔ اور میں جانتی نہ تھی۔ کھاتے تھے اور مجھے خبر نہ ہوتی تھی +
میاں۔ جب کیا میں تو اب بھی فقط اندھی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ بدتمیز۔ بے ڈھنگی۔ پھوہڑ۔ بدسلیقہ۔ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ ایسی نیک قدم آئیں کہ سب ختم ہو گئے +
بیوی۔ میں منحوس تھی کہ گھر بھر کو موس لیا! ساٹھ برس کے بڈھے پھوس میں کھا گئی! تم تو بھاگوان تھے کہ میری نوجوان اماں کو نوش جان کر گئے! تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا۔ فاقوں تک کی نوبت آ گئی اور کیا ہوگا +
میاں۔ ہم نے تو چڑھاوے ہی کے وقت کہہ دیا تھا کہ روکھی بلکہ سوکھی روٹی ہے۔ اماں کی قبر پر جا کر جوتیاں مارو۔ اندھی تھوڑی تھیں! کیا دیکھ کیا تھا! ہاتھی جھوم رہے تھے؟
بیوی۔ کیوں مرے ہوؤں کا صبر سمیٹتے ہو! خیر اس تو تُو مَیں مَیں سے کیا حاصل۔ میں تو ڈیڑھ کلام جانتی ہوں۔ ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کرو تم کو سلام تمہارے گھر کو سلام۔ میں ایسے گھر سے باز آئی! اشراف ہونگی تو پھر نام نہ لونگی +
میاں۔ شرافت کیا ہوئی ایک آفت ہو گئی۔ میری طرف سے تم ابھی بسم اللہ کرو۔ تم نام نہ لوگی تو میرا بھی کوئی پیغام نہ جائے گا۔ بس اب منہ سے کہا

ہے تو کر کے دکھاؤ ٭

بیوی۔ آگ لگے ایسے بیاہ کو اور بھاڑ میں جائے ایسا سہاگ۔ اذان کی آواز کان میں آ رہی ہے۔ روزہ نماز سب گیا گزرا ہوا ٭

دن بھر کا روزہ۔ رات بھر کا فاقہ۔ مٹکے پاس گئی تو پانی کی بوند نہیں آبخورے میں نون ڈھونڈا۔ وہ نہ ملا۔ کٹورے میں دو چھوہارے رکھے تھے۔ وہ چوہا لے گیا۔ چولھے کے پاس یہ کہتی ہوئی آئی!

"خاک میں ملوں میں رکھتی جو راکھ سے روزہ کھولوں!"

چوبیس پچیس گھنٹے کی بھوکی پیاسی۔ بخار چڑھا ہوا۔ آنکھوں میں حلقے۔ زبان پر کانٹے۔ ہاتھ میں طاقت نہ پاؤں میں سکت۔ روزہ کھول کر نماز کو چلی! چکر آیا اور چکر کے ساتھ ہی دیوار گئی مگر اس زور سے لگی کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ رو کر کہا "بس میں بہت اچھی۔ اب خدا مجھ کو موت دے" ٭

بیوی نماز کو کھڑی ہوئیں۔ میاں نے اپنا اسباب باندھنا شروع کیا۔ وہ اسباب ہی کیا تھا۔ پرانے تین جوڑوں کی ایک گٹھڑی۔ ٹوٹا ہوا حقہ پھٹی ہوئی رضائی۔ چوہا نکلے۔ ایک جھپٹا اور ہی! بیوی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی۔ اور میاں اپنا اختر بختر لے یہ جا وہ جا ٭

گئے اور ایسے گئے کہ بچہ تک ہو گیا اور بچے کے باپ نہ پلٹے ٭

اچھے برے۔ امیر فقیر۔ کماؤ نکھٹو شریف رذیل معزز۔ ذلیل ہندو اور مسلمان۔ بڈھے اور جوان۔ کچھ دیکھے اور برتے۔ مگر یہ اندھیر کہیں دیکھا نہ سنا۔

پورے دن بیوی۔ پہلوٹی کی زچہ۔ سسر پر ساس نہ آوجی پاس۔ نہانے کا

برتن نہ گھنے کا تار۔ ماں سوتیلی۔ باپ بیزار اور میاں کو گھر میں قدم رکھنا حرام! کمبخت صورت شکل کا اچھا جوان تندرست۔ پڑھا لکھا موٹا تازہ۔ کچھ ہوتا تو چپڑاسی تو ہو جاتا! مگر کون ہوتا اور کیوں ہوتا! بُری صحبت نے غیرت اور حمیت سب غارت کروادی! مزے سے تاش چھپی اور چین سے سلمٹی کعبتین! دن بھر پھڑوں میں رہے۔ رات کو جہاں جگہ ملی پڑ رہے!

تکلیف ہو خواہ آرام۔ عمریں ختم ہو رہی ہیں۔ اور زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے وہ وقت آن بھی پہنچا اور نکل بھی گیا۔ کسی کا کام اٹکا نہیں رہتا۔ خدا اسلام کی بیوی کا بھلا کرے۔ ساس سے زیادہ اور ماں سے بڑھ کر خدمت کی بچہ ہُوا۔ پلا۔ بڑھا جس رات کا یہ ذکر ہے ماشاءاللہ برس سوا برس کا تھا!

برسات کے دن تو تھے ہی مینہ کا برسنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر خرابی یہ ہوئی ادھر تو پڑا مینہ۔ اور مینہ بھی کیسا کہ موسلادھار۔ اور گھنٹہ نہ آدھ گھنٹہ۔ بلکہ پورا چار پہر۔ اوپر سے چلی ہَوا۔ اور وہ بھی پُروا۔ ہُوا کیا ایک طوفان تھا کہ مکان اور دُکان۔ در اور دالان اُڑ اُڑ کر آ رہے تھے۔ نہ اندھیاؤ کم ہوتا تھا۔ نہ جھکڑ تھمتا تھا۔ رات کا سناٹا! ہَوا کا فراٹا! کڑک یا چمک! مردوں تک کے کلیجے دہل رہے تھے! بارش کیا ایک آفت بلکہ قیامت تھی کہ جانوں کے لالے پڑ گئے۔ عورتیں اور مرد۔ بڈھے اور جوان! گھر بار کمرے دالان۔ کپڑے لتے اوڑھنا بچھونا! روپیہ پیسہ۔ چاندی سونا! گھنا پاتا۔ برتن بھانڈا۔ پلنگ چارپائی سب چھوڑ چھاڑ انگنائی میں آ بیٹھے! بھیگیں گے تو بلا سے۔ جان تو بچے گی ہر طرف آفت بپا تھی۔ مکان گرا! دیوار آئی! سائبان اُڑا! چھپل نکلی!

چھجہ بھولا! زینہ پھٹا! آدھی رات اور خلقِ خدا کی گریہ وزاری! مینہ کیا ایک چاندماری تھی۔ کہ چاروں طرف سے دھواں دھوں آوازیں آرہی تھیں ٭

حمیدہ غریب بدقسمت۔ بدنصیب عورت ذات۔ کوئی سنگ نہ ساتھ اس قیامت کی گھڑی کو اکیلی کھڑی گزار رہی تھی! قدرت کے کھیل تھے۔ چراغ تھا نہ تیل! اندھیر اگھپ۔ اور اس آفت کا سامنا! بدقسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا! ہوا کا جھکڑ۔ کواڑ کی دھڑا دھڑ! دم پر بنی ہوئی تھی۔ ذرا کھٹکا ہوا اور جان نکلی! عالی شان محل۔ بڑی بڑی حویلیاں۔ پکی پکی محلسرائیں کوئی گر رہا تھا۔ کوئی جھک رہا تھا۔ کوئی بیٹھ رہا تھا! حمیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا۔ لمبی کوٹھڑی چھوٹا دراجمام والی دیوار۔ شام ہی کو بیٹھ چکے تھے۔ پاخانہ اور پاخانہ کے ساتھ ہی باورچی خانہ اب آ گئے!

مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور حمیدہ کھڑی اللہ اللہ کر رہی تھی۔ آسمان پر نگاہ اور بچہ میں جان۔ دروازے پہ دھیان۔ اور درے کی طرف کان! ایک آفت ہو تو کہی جائے۔ ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی۔ حمیدہ اکیلی کا اللہ ہی بیلی تھا۔ چھت کہتی تھی اب گری۔ درہ کہتا تھا اب بیٹھا! پہاڑ سی رات ایک کواڑ کا گھر۔ جان کا خوف۔ چور چکار کا ڈر۔ جن بھوت کا اندیشہ! دل ہوا ہو رہا تھا! مٹی تو دوپہر ہی سے جھڑ رہی تھی۔ اب منڈیر کی اینٹیں بھی گرنی شروع ہو گئیں! اینٹوں کا گرنا تھا کہ حمیدہ بالکل ہی بے آس ہو گئی۔ بدحواس ہو کر بچہ کو تو گود میں اٹھا لیا اور انگنائی میں آن کھڑی ہوئی بچہ کا اٹھانا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بلکنا شروع کیا۔ بہتیرا ہی بہلایا۔ مگر تو بہ کس بات

کا بچہ تھا جوں جوں چمکارتی تھی اور دگنا روتا تھا۔ تھپکا۔ دودھ دیا۔ بہلایا پھسلایا۔ ٹہلی کلیجہ سے لگایا سب ہی کچھ کیا۔ مگر اس کی چیخ دھاڑ نہ تھمی! ہائے مامتا۔ اُس برس بھر کی جان پر اپنی جان قربان تھی۔ اس پھول کے رونے میں سب بھول گئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوتے ادھر مینہ تھما۔ اُدھر ہوا کم ہوئی۔ بچے نے بھی دم لیا۔ تو ذرا جان میں جان آئی! ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی اندر سے لائی۔ پھٹی رضائی اُس پر بچھائی۔ اور بچے کو کلیجے سے لگا کر اُنگنائی میں لیٹ رہی! بچہ ہلکان ہو کر جو پڑا۔ ادھر ملی لوری۔ اُدھر ماں کا چھوا دودھ منہ میں لیتے ہی گلے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا۔ اللہ اللہ! بچے کا کلیجے سے لگ کر سوتا تھا۔ کہ وہ رات بھر کی مصیبت و پریشانی کچھ بھی یاد نہ رہی۔ میاں کی بے اعتنائی۔ باپ کی بے پروائی۔ اپنی تنہائی سب بھول گئی! مامتا کے جوش میں زور زور سے بھینچتی تھی اور کہتی تھی:-

"میں کیا کسی کی پروا کرتی ہوں۔ اللہ میرے بچے کی عمر میں برکت دے۔ میرا میاں تو یہ ہے"

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اُس ننھی سی جان پر نثار تھیں! اُس ہی کے دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان لگے ہوئے تھے! لپٹ رہی تھی اور چپٹ رہی تھی اور چمٹا رہی تھی۔ حمیدہ مظلوم اسی طرح قربان ہو رہی تھی۔ کہ برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی! اُٹھی درود شریف کا جزوان بچے کے پاس لا کر رکھا۔ وضو کیا۔ اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی +

سارس کی تارک الوطنی

ارتشی کے وسیع میدان میں چاندنی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور دامنِ کوہ میں خاموش چشمہ کے کنارے ایک سارس کا جوڑا تارک الوطن ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گو ان کے دماغ (یعنی احساس انسانی کا مرکز) اس قوت سے محروم تھے۔ جو اس قصد کے نقائص و تکالیف ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتی۔ تاہم وطن کی مفارقت کا اثر ان کے اعضار جسمانی۔ ان کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا۔ دونوں خموشی کے ساتھ کھڑے پہاڑ کی بلند چوٹیوں کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ آبشار بلندی سے گرتے تھے اور اس بھولی بھالی مخلوق کی قوت سامعہ ہوا کے تیز جھونکوں کی بدولت معمول سے زیادہ کام کر رہی تھی۔ دو ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ جوڑا قدرت کی اس دلچسپی اور وطن کے در و دیوار کو غور سے دیکھتا رہا۔ آخر چاند کی روشنی کا انحطاط سارس کی توجہ میں خلل انداز ہوا۔ اور وہ آتش فشاں پہاڑ جو قمر چار دہم کے اندر صاف و روشن نظر آ رہے تھے۔ دھندلے دکھائی دینے لگے۔

زمین اپنے محور کے گرد چکر کھاتی ہوئی رات کو کنار صبح تک لے آئی۔ شیر اور چیتے جن کی دھاڑوں نے تمام جنگل سر پر اُٹھا رکھا تھا اپنے اپنے غاروں میں جانے شروع ہو گئے۔ اور کسی خوش الحان پرندے نے تاڑ کے درخت

پر بے صبح صادق کا مژدہ سُنایا ۔

ایک خاص خیال میں اس قدر دیر تک متوجہ رہنے پر بھی نر کی قوت متخیلہ کچھ زیادہ کارآمد نہ ہوئی۔ وہ نہ سوچ سکا کہ غربت میں کیا مصیبتیں پیش آئیں گی۔ اور کیسی کیسی دقتیں اُٹھانی پڑیں گی۔ چاند کی روشنی لمحہ بہ لمحہ پھیکی پڑ رہی تھی۔ سارس نے دفعتہً اپنا منہ مادہ کی طرف کیا۔ اس کے کندھوں پر اپنی گردن رکھی۔ اُس کے کاسنی پروں کو جو فاختائی مائل تھے۔ آنکھوں سے لگایا۔ اور اسی طرح جذبات قلب پورے کر کے کہنے لگا:۔
"چل چل۔ پیاری مادہ۔ ایسے میں اُڑ چلیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بہت دُور نکل جائیں گے۔ ورنہ مشرقی شہسوار تخت آسمان پر جلوہ گر ہو جائے گا۔ اور پھر تیرے نازک بازو شاید گرم ہوا کا مقابلہ آسانی سے نہ کر سکیں۔ اُٹھ اُٹھ من موہنی، مادہ چل گھڑی ہو۔ میری زندگی کی تمام خوشیاں تیرے ان چمکدار پروں میں پوشیدہ ہیں۔ تیرا یہ حسن دلفریب میری زندگی برقرار رکھنے اور مجھ کو ہمیشہ کامیاب بنانے کے لئے کافی ہے"۔

چونکہ سارس اپنے سفر کا ارادہ اپنی تارک الوطنی کا قصد شام ہی سے ظاہر کر چکا تھا۔ اس لئے مادہ نے اپنے گلابی مائل سُرخ رخسار قریب لا کر پہلے سچی محبت کا جواب دیا۔ اور پھر اس طرح مخاطب ہوئی +

"مجھ کو حکم کی تعمیل میں عذر نہیں۔ مگر کیا کروں قدرت نے میری سرشت میں یہ مادہ ودیعت کیا ہے کہ میں اس مرغزار کے چپے چپے کی جُدائی جہاں میں چھوٹی سے بڑی ہوئی محسوس کروں۔ پہاڑ کی چوٹیاں اُس وقت سے

میرے سامنے ہیں جب سے میری آنکھ کھلی۔ آبشاروں کی آوازیں اُس وقت سے میرے کانوں میں ہیں۔ جب سے میں اُن کو سننے کے قابل ہوئی۔ یہ درختوں کے پتّے اور کنار نہر کے خودرو پھول جو ہمیشہ سے میری آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کا فراق مجھے سخت تکلیف دہ ہوگا۔ اُس پار پہنچ کر نئی زمین ہوگی۔ نیا آسمان۔ نیا دانہ۔ نیا پانی۔ مگر یہ سرزمین جس کے چپے چپے اور کونے کونے پر میرے قدم چلے ہیں۔ مجھ سے چھوٹ جائے گی۔ اور یہ ہوا جس نے مجھ کو تھپک تھپک کر لوریاں دی ہیں۔ مجھ سے کوسوں دُور ہو جائیگی۔ آخر مجھے معلوم تو ہو وہ کیا چیز ہے جس نے تم کو ایسا دل برداشتہ کیا۔ کہ وطن جیسی چیز کو عمر بھر کے لئے خیرباد کہتے ہو"۔

سارس۔ مَیں نہیں چاہتا کہ ایسی جگہ زندگی بسر کروں۔ جہاں بیوفا اور خودغرض انسان کا گزر ہو سکے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسی نفس پرور مخلوق کے خیالات سے متاثر ہو کر میری آئندہ نسل برباد ہو جائے گی۔

مادہ۔ تم مجھ کو اجازت دو تو میں استفسار عرض کرنے کی جرأت کروں۔ کہ ہمارا اس حد تک انسان سے نفرت کرنا ایک قسم کی (محسن کشی) ہے۔ جو ہمارا شیوہ نہیں۔ دُنیا بالکل اُجاڑ ہوتی۔ ہم ہی جیسے کائیں کائیں کرنے والے چاروں طرف آباد ہوتے۔ کائنات کی کل ہستی یہ ہوتی کہ لنگوروں کی چھلانگیں چیلوں کی چیل۔ ہرن چکارے۔ بارہ سنگے۔ سانپ۔ مچھلی کینچوے بچھوے وغیرہ وغیرہ۔

قدرت کو ضرورت تھی ایک ایسی مخلوق کی جو نظامِ عالم کی داد دے۔

اور صنعت دنیا کو دیکھ کر صناع حقیقی کے کمال کا اعتراف کرے۔ پس انسان کی خلقت ضرورت ہے قدرت کی۔ اور یہ اسی مخلوق کا کام تھا کہ اپنی محنت اور عقل کی بدولت پہاڑوں سے چشمے بہا دیئے۔ اور آسمان پر بے پر و بال اس طرح پہنچا کہ چاند تاروں تک کی حقیقت معلوم کر لی۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ یہ طرح طرح کے میوے۔ یہ ہرے بھرے کھیت۔ یہ لہلہاتے ہوئے درخت جن سے ہمارے گردو پیش کی زمین مالا مال ہے ہم کو محض انسان کی سعی سے میسّر ہوئے۔ ورنہ پہاڑوں کے سنگریزے ہماری خوراک ہوتی اور کوہ آتش فشاں کا ملغوبہ ہمارا پانی ۔

ایسی اچھی اور کار آمد مخلوق جس کی محنت سے ہم ہر طرح مستفید ہوں اس قدر نفرت کی مستوجب نہیں ۔

سارس۔ مگر انسان جیسی دغا باز شے جو تیری نگاہ میں اشرف اور میری رائے میں ارذل ہے۔ ہرگز پسند کے قابل نہیں۔ اس کی سرشت میں دھوکا۔ اس کی طینت میں دغا۔ اور اس کی گھٹی میں خود غرضی پڑی ہوئی ہے۔ افسوس میں نے صبح ہی صبح ایک نہایت منحوس چیز کا نام لیا۔ انسان؟ کیا انسان دغا باز مکّار۔ جس کی محبت جھوٹی۔ جس کی باتیں بناوٹی۔ جس کا دل ظلمت کدہ سچا احساس اس سے کوسوں دُور۔ اور اچھے خیال اس سے میلوں پرے۔ دیکھ وہ سورج کی کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں پر پڑنے لگیں۔ اب ہمارا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ افسوس آج کا سفر ملتوی ہوا چل پہاڑ پر چلیں اور حیات انسانی کی کیفیت مجھ سے سُن۔

دو آٹھ دس برس کا عرصہ ہوا میں بچّہ ہی سا تھا۔ ایک رات جبکہ چاندنی

چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی میرے باپ نے باہر نکل کر دیکھا۔ درختوں کے
پتوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایک نور سا برس رہا تھا۔ پیاری بی بی تجھے
کبھی پردیس جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر راستہ میں میرا قدیمی مکان پڑا تو
میں تجھے دکھاؤنگا۔ کہ وہ کیسا پُر فضا مقام ہے۔ دامنِ کوہ سے چشمو نکا اتر اتر
کر اور مچل مچل کر چلنا تجھ کو بتا دے گا۔ کہ قدرت نے میری پرورش کے واسطے
کیسی دلفریب اور عجیب جگہ انتخاب کی تھی۔ ہاں تو شب ماہ اپنا بناؤ سنگھار
کیئے پردۂ دنیا پر جلوہ گر تھی۔ والد مرحوم کا دل سیر کو چاہا۔ مجھے اور میری ماں
کو ساتھ لیا۔ اور ہم تینوں ہوا میں اُڑے۔ تاروں نے بساطِ فلک کو جبین
عروس بنا رکھا تھا۔ ہم کو کسی خاص جگہ پر جانا مقصود نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں
نے پورب کی طرف دھکیل دیا اور ہم چاندنی کا لطف اُٹھاتے اُسی طرف کو روانہ ہو گئے
رات اٹھلا اٹھلا کے اپنا رستہ طے کر رہی تھی ہم جزیرہ ارسیوان میں پہنچے
تو ہمارا گزر قصرِ سلطانی پر ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ شہزادہ الیاس بھی ہماری طرح
شبِ ماہ کا اُٹھا رہا ہے۔ اور اُس کی معشوقہ برابر میں بیٹھی ٹھنک ٹھنک
کر باتیں کر رہی ہے۔ الیاس ٹکٹکی باندھے اُس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ
عجب قسم کی محبت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی چونکہ محبت ہمارے مادہ
ہمارے دماغ اور خیال سے ارفع و اعلیٰ ہے میں اس کی صراحت سے مجبور
ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی کی ایک ایک ادا الیاس کا کلیجہ مجروح
کر رہی ہے۔ وہ دیوانہ وار شہزادی پر نثار ہو رہا تھا کبھی اسکے نازک ہاتھ
اپنی آنکھوں پر رکھتا تھا کبھی آراستہ و پیراستہ زلف کو سونگھ کر جھومتا کچھ دیر

تک تو اس طرح قلب مضطرب کو تسکین دی۔ اور پھر بیتاب ہو کر کہنے لگا:۔

"سلطنت کا لطف بھی اُسی وقت تک ہے جبتک کہ تو میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ ورنہ شہزادی تمام سامان عیش ہیچ ہے۔ گل اندام اپنے پیارے ہاتھوں سے ایک جام تو دے"۔

شاید عورت کی فطرت ہی میں یہ داخل ہوگا کہ شہزادی الیاس کو اس قدر والہ و شیدا دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی۔ اس کے حسن کی چمک پہلے سے دوچند ہوگئی۔ گلاب سے رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چاہتی تھی۔ کہ آگے بڑھ کر شیشہ و ساغر اُٹھائے۔ الیاس نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور کہنے لگا "ان ہاتھوں کو اس قسم کی تکلیف دینا منشاء قدرت کے خلاف ہے"۔ یہ کہہ کر شہزادہ الیاس نے جام بلوریں آگے رکھا۔ شہزادی ساغر تیار کر رہی تھی۔ کہ اتفاق سے شیشہ ٹوٹا اور کلائی بالکل لہولہان ہوگئی۔ اس وقت الیاس کی بےچینی بیان نہیں ہوسکتی۔ آنکھ سے آنسو نکل پڑے رومال بھگو کر کلائی پر باندھا اور کہنے لگا "اس خون کا ہر قطرہ میرے کلیجہ سے نکل رہا ہے۔ کاش میرا پورا ہاتھ کٹ جاتا۔ میں مرجاتا۔ شہید ہو جاتا۔ مگر میری وجہ سے اس سرخ و سفید کلائی کو یہ اذیت نہ ہوتی"۔

شہزادہ یہیں تک پہنچا تھا۔ کہ میری ماں اپنے خاصۂ فطرت کے موافق والد مرحوم کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور کہنے لگی:۔

"سچ یہ ہے۔ انسان سے زیادہ محبت کی قدر کوئی مخلوق نہیں کرسکتی"۔

یہ کہہ کر وہ اور اُس کے پیچھے پیچھے ہم باپ بیٹے اُڑے اور اپنے گھر کو واپس آئے

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس واقعہ کے کتنے روز بعد ایک روز میں سمت مشرق سے آرہا تھا۔ رستہ میں جزیرہ ارسیوان پڑا میرے دل نے گوارا نہ کیا۔ کہ شہزادی کو جس کے ساتھ مجھے اس رات اتنی ہمدردی ہوگئی تھی۔ بغیر دیکھے چلا جاؤں۔ چنانچہ میں قصر سلطانی پہ ٹھٹکا۔ دوپہر کا سنسان وقت تھا۔ اور گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ الیاس غمگین و محزون پڑا رو رہا ہے۔ دفعتہً ایک شخص آیا اور خط دے کر چلا گیا۔ مجھے سخت تعجب تھا۔ کہ الیاس نے سیکڑوں مرتبہ وہ خط کھولا پڑھا۔ اور سر آنکھوں پر رکھا۔ آخر باآواز بلند کہنے لگا "یہ ظالم اب تک اسی ہٹ پر قائم ہے۔ کہ شہزادی کی زندگی میں مجھ سے کسی تعلق کی امید بالکل فضول۔ خیر یہ کیا بڑی بات ہے۔ لاؤ آج اس قضیہ کا بھی فیصلہ کر دوں" یہ کہہ کر الیاس اندر گیا۔ اور ایک خنجر آبدار لے کر باہر نکلا۔ اس کی دھار دیکھی اور کمر میں لگا کر اس کمرہ میں آیا۔ جو میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ آہ پیاری مادہ آگے بیان کرتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے۔ وہی شہزادی جو کسی وقت الیاس کے دل پر اچھی طرح قابض اور تمام سلطنت کی مالک تھی۔ سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ الیاس کی صورت دیکھتے ہی شہزادی گھبرا کر اٹھی۔ گو وہ بالکل ساکت کھڑی تھی مگر سر سے پا تک ایک ناامیدی کی تصویر تھی۔ اس کی بڑی اور رسیلی آنکھیں جو اس وقت گلابی ہو گئی تھیں۔ بحسرت و یاس الیاس کے چہرہ پر تھیں۔ اور اس کے تکلیف دہ خیالات کی پریشانی کا اظہار اس کی صورت سے ظاہر تھا۔ نرم اور نازک رخسار گلاب کی پتیوں کی طرح آفات ناگہانی سے مرجھا چکے تھے اور وہ دل

جس میں کبھی عشرت و شادمانی کا راج تھا۔ اس وقت مصائب کی پوٹ بنا ہوا تھا۔

پہلو میں ننھا سا دل رکھنے والی مادہ! مجھے اندیشہ ہے کہ اب وہ واقعات تجھ کو رُلا نہ دیں جس وقت سفاک الیاس نے کمر سے خنجر نکالا۔ اُس کی چمک دیکھ کر شہزادی سہم گئی۔ اوسان جاتے رہے۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ الیاس آگے بڑھا۔ شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ اور کہا تیرا جام عمر لبریز ہو چکا ہے۔ یہ خنجر تیرا کام تمام کر دے گا۔ اِدھر آ۔ اور مرنے کے واسطے تیار ہو"۔

اتنا کہہ کر خنجر اُٹھایا۔ چاہتا تھا کہ کام تمام کر دے۔ شہزادی نے بہ منت یہ الفاظ کہے:-

"میں بے گناہ ہوں۔ جس دماغ میں آج سے پندرہ بیس برس پہلے میری محبت کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ آج اس میں قتل کی تجویزیں ہیں۔ بادشاہ جن آنکھوں سے آج خون ٹپک رہا ہے۔ یہ کبھی میری طرف پیار و محبت سے بھی اُٹھی ہیں۔ اگر تیری کامیابی صرف میری موت پر منحصر ہے۔ تو میں یہ جان قربان کرتی ہوں۔ لیکن نافرمانی کا الزام میرے اوپر بہتان ہے۔ الیاس وہ کام نہ کر کہ میرے دونوں بچے دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کریں۔ میں جانتی ہوں کہ تھوڑی دیر میں میرا جسم اس فرش پر تڑپ رہا ہو گا۔ اور جب تک تیری آنکھیں مجھ کو مردہ نہ دیکھ لیں دل ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ بائیس سال تیرے ساتھ زندگی بسر کی۔ تیری بدولت دُنیا کے لطف اُٹھائے۔ ایک ایسے رفیق کو جان نذر کر دینی کوئی بڑی بات نہیں

اب میں اجازت دیتی ہوں۔ کہ تو شوق سے اپنی خواہش پوری کر۔

ابھی یہ پہلا فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ظالم الیاس نے آبدار خنجر کو حرکت دی اور عین اُس وقت جب کہ مظلوم شہزادی کی آنکھیں اپنے خاوند کے چہرہ کو تک رہی تھیں۔ اُس کے کلیجہ میں بھونک دیا۔

کیوں مادہ! کیا وہ مذہب اور اخلاق اور قانون جس پر انسان بہت کچھ نازاں ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ ابتدائے دنیا سے آج تک ہم نے بہت کچھ ترقی کر لی۔ یہی تعلیم دیتا ہے؟ کیا وہ شہزادی جس نے عفت و عصمت جیسی چیز قربان کر دی۔ کیا وہ عورت جس کو الیاس نے زبردستی اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اسی سلوک کی مستحق تھی؟ کس طرح سنگدل الیاس کا ہاتھ ایک بے گناہ برسوں کی رفیق اور برسوں کی ساتھی عورت پر اُٹھا؟

یہ کچھ ایسا دردانگیز سماں تھا۔ کہ میرے پر شل اور ہاتھ پاؤں بیکار ہو گئے۔ طاقت پرواز نہ رہی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ میں نے وہیں بسیرا لیا۔ اور رات کو جس وقت میں نے یہ دیکھا۔ کہ ایک نئی عورت الیاس کی خوابگاہ میں داخل ہوئی۔ اور الیاس اُس کے استقبال کو اُٹھا۔ مجھ میں دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ میں اُڑا اور راتوں رات اپنے گھر پہنچا۔

میرا دماغ اُس وقت بالکل صحیح نہ تھا۔ پریشان خیالات نے میری تمام قوت زائل کر دی تھی۔ ہر چند چاہتا تھا۔ کہ تھوڑی سی نیند لے کر دماغ کو تسکین دوں۔ مگر بے گناہ شہزادی کی آخری گفتگو میرے کانوں میں موجود تھی۔ اور کسی طرح نہ بھولتی تھی۔

بدقت تمام رات بسر کی بیکسی کائنات کی اس قابل ناز شے یعنی انسان کے مطالعہ کا مجھ کو اسقدر شوق ہوا۔ کہ میں پھر آبادی میں پہنچا۔ شہر میں ایک پہاڑی تھی جس پر سہ منزلہ اور چومنزلہ مکان بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بلند مکان دیکھ کر میں ممٹی پر جا بیٹھا +

قوت مشاہدہ میری مددگار تھی۔ تمام شہر میری آنکھ کے سامنے تھا۔ اور میری آنکھ افعال انسانی پر بغرض تحقیقات پڑ رہی تھی میرا خیال تھا کہ وہ مابہ الامتیاز شے جس نے اس مخلوق کو اشرف بنادیا۔ حیات انسانی کی رہنما ہوگی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انسوس ہوا۔ کہ ان سیکڑوں اور ہزاروں ذی روح لوگوں میں ایک متنفس بھی ایسا نظر آیا جس پر انسان کا اطلاق جائز ہو سکتا + اُن بخارات کی طرح جو شدت حرارت و تمازت آفتاب سے پہاڑ کی چٹانوں یا تپتے ہوئے کرۂ زمین سے نکل کر ہوا میں اُڑتے رہتے ہیں میری نگاہ ابھی تک کہیں ٹھیری نہ تھی۔ اور مطالعۂ انسان کے اشتیاق نے مجھ کو اسقدر بےتاب کر دیا تھا۔ کہ قوت باصرہ کی رفتار حد آخر تک پہنچ چکی تھی۔ رنگ برنگ کی اشیا مختلف ہیئت و صورت کے اجسام سامنے سے گزر رہے تھے۔ مگر چونکہ متجسس نگاہ سرعت کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ میں ان میں سے کسی کو تمیز نہ کر سکا۔ یہانتک کہ ایک زرد دوپٹہ بیچ میں آ کر حائل ہوا۔ اور میری تمام توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ یہ دوپٹہ انسان کے اُس کمزور فرقے کے سر پر تھا۔ جو عورت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ کپڑا بجائے سرخ رنگ اور چمکدار ہونے کے پھٹا ہوا اور میلا کچیلا تھا۔ الیاس کے ظلم اور شہزادی کی منت وزاری

نے میرے دل میں اس فرقے کی حمایت پیدا کر دی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس عورت کو دیکھا۔ گو شہزادی کی طرح اس کے پاس دلفریبی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اور باوجودیکہ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بجائے دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے کے اس چار دیواری سے جس میں یہ موجود تھی۔ ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہے تھے۔ تاہم اس کے چہرہ سے خوشی کا مینہ برس رہا تھا۔ جہاں تک میرا خیال حیوانی کام دے سکا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فکر و غم کی گھٹا اُس کے قلب سے بالکل نا آشنا ہے۔ افسوس میرے نتیجہ نے مجھ کو مغالطہ دیا۔ میں نہ سمجھ سکا۔ کہ یہ حالت مستقل نہیں عارضی ہے۔ اور یہ زور کا چھینٹا تھوڑی دیر بعد کھل جائے گا۔ اور یہ دل جو اس وقت باغ باغ ہے۔ اس پر حوادث کی بجلی چمک چمک کر اور کڑک کڑک کر گرے گی +

یہ عورت ایک ٹوٹے سے کھرّے کھٹولے پر صحن میں بیٹھی تھی۔ اور اندر اس کی تین چار ہم جنسیں مختلف کاموں میں مصروف تھیں + اس زرد دوپٹہ میں مجھے کوئی چیز کلبلاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کوئی بے جان نہ تھی۔ جاندار تھی۔ اور طاقتور تھی۔ اور یہ کوشش کر رہی تھی۔ کہ کسی طرح اس پھٹے ہوئے دوپٹہ کو ہٹا کر باہر نکلے۔ مگر عورت کی طاقت غالب تھی۔ وہ چاروں طرف سے دوپٹہ کو چھپاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ یہ قوت اور اُسکا یہ فعل ان ہم جنسوں کے علم میں نہ آئے۔ جو سامنے ہیں + کچھ دیر تک ان دونوں میں کشمکش رہی اور بالآخر چھوٹی طاقت نے بڑی طاقت کی طرف سے تھوڑی سی محبت شامل ہوئی۔ دوپٹہ سرکا تو میں نے دیکھا۔ کہ ایک ننھا سا بچہ گود میں پڑا دودھ پی رہا ہے۔

نرم رخساروں پر ہنسی کی پھریاں۔ پیارے پیارے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ماں کے منہ پر ٹکٹکی تھی۔ بچّہ کی یہ کیفیت دیکھ کر چونکہ میں خود صاحب اولاد تھا۔ کس قدر خوش ہوا ہوں۔ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کا ننھا سا دل دنیا کے تفکرات سے بالکل آزاد تھا۔ اس کی تمام سلطنت ماں کی گود تھی۔ جس میں پڑا ہوا حکومت کر رہا تھا۔ جس پیار اور محبّت سے ماں کی نگاہیں اس بچہ پر پڑ رہی تھیں۔ وہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ جھکتی تھی طرح طرح کے منہ بنا کر چمٹتی تھی۔ مختلف ناموں سے پکارتی تھی۔ بھینچ بھینچ کر لپٹتی تھی۔ اس کی گود میں ایک ایسی لازوال دولت اور بیش بہا خزانہ تھا جس کی خوشی کا احساس کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ مامتا دماغ میں خیال اور خیال میں بلندیاں دل میں حوصلے اور حوصلوں میں اُمیدیں پیدا کر رہی تھی۔ اس کی حرکات قریب قریب مجنونانہ تھیں۔ مگر کچھ ایسی خوشی سے لبریز تھیں۔ کہ اس کا پتہ مجھ کو ان خوشیوں میں بھی نہ ملا جو الیاس و شہزادی کے پاس شب ماہ میں تھیں غرض محبت سے چومتے چومتے خیالات نے اُمیدوں کو جامہ کامیابی پہنایا۔ چاہتی تھی کہ کلیجہ سے لگا کر ہولے ہولے تھپڑ مارے۔ دفعتہً ایک ہم جنس سنگدل کی خنگی اور اس فقرے نے اس کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا ؏

"کیوں ری آتا کمبخت تو لے پھر اپنے بچّے کو دودھ دیا!"

خدا معلوم اس فقرے کی تہ میں ایسی کیا چیز چھپی تھی۔ جو بلے نکر دل پر تیر کی طرح جا کر لگی۔ اور ہشاش بشاش چہرے کو جس پر رنج و غم کا نشان تک نہ تھا۔ بالکل سہما دیا۔ اتنی عمر ہونے آئی۔ مگر آج تک اتنی جلدی میں نے کبھی آسمان

کو بھی رنگ بدلتے نہ دیکھا جس کے وہم و گمان میں بھی انقلاب کا اندیشہ نہ تھا جو خلقت اور صنعت سب کو ہیچ سمجھ رہی تھی جس کی تمام خوشیاں جس کے تمام خیالات اس دو ڈھائی سیر کے لوتھڑے میں محدود تھے۔ جس کے دماغ میں اس بے بہا نعمت نے اپنا سکہ بٹھا رکھا تھا۔ اور جس کے دل میں یہ ننھا سا لال راج کر رہا تھا۔ دفعتہً سٹ پٹا گئی۔ بچے کو وہیں پٹخا اور سہمی ہوئی اکھڑی ہوئی۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور گھگیا گھگیا کر کہہ رہی تھی:-

"نہیں تو بیگم! بڑی دیر سے رو رہا تھا میں نے گود میں اٹھا لیا"

ماں کی گود کا فراق اور دودھ کا چھٹنا تھا۔ کہ ننھا سا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تعجب تو یہ تھا۔ کہ ہر چند چیخا چلایا۔ مگر واقعات نے ماں کو اتنی اجازت نہ دی۔ کہ اپنی صورت دکھا کر فوری رنج کی تلافی کر دیتی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جوں جوں اظہار تکلیف میں جس کا ذریعہ رونے کے سوا بچے کے پاس کچھ اور نہ تھا۔ زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ ماں کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ میں دور بیٹھا ہوا بہت کچھ تڑپا۔ مگر بے بس تھا۔ بہتیرا غور کیا۔ مگر تیا اس نے [illegible] دی۔ کہ اس سنگ دل عورت کے فعل پر کوئی رائے قائم کرتا۔ ہر چند وجہ ارتکاب سوچتا تھا۔ مگر کوئی خیال ٹھیک نہ بیٹھا۔ باوجود اس ناکامی کے کہ دماغ نے کوئی صائب رائے نہ دی۔ چونکہ افراط تخیلات کا مرض مجھ کو لاحق ہے۔ میں اس جھگڑے کے الٹ پھیر میں پھنسا رہا ممکن ہے۔ کہ غلط ہو۔ مگر میں جو قیاس لگا سکا اور جو رائے قائم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ یہ تھی کہ زرد دوپٹہ والی عورت کی کچھ ایسی

اغراض ان ہمجنسوں سے وابستہ تھیں جن کا پورا ہونا ضروریات زندگی میں شامل اور بقاء حیات کا جزو لازمی تھا ؛

مگر اے مادہ! البشریت اسی کا نام ہے ۔ اور ان حرکات کا فاعل انسان کہے جانے کا مستحق ہے؟ بول بول پیاری مادہ! کس دل سے اس شقی القلب عورت نے ماں بیٹوں کے دورِ محبت کو درہم برہم کردیا؟ وہ ذرا سا دل جو آزادی سے پڑا ہوا کلکاریاں مار رہا تھا ۔ اس سنگدلی کی وجہ سے چیخیں مار مار کر رونے لگا ۔ اور اس کو پروا بھی نہ ہوئی ۔ محض اپنے بچے کی محبت باعتبار تموّل برتر ہونے کا زعم یا اسی کے قریب قریب کچھ اُور ہونے کی رعونت ۔ کیا سب جائز تھے؟ اس لئے کہ اپنی ہی جیسی عورت ۔ اپنی ہی جیسی انسان کی ماںتا صرف اس وجہ سے کہ اسکی ضرورتیں اٹکی ہوئی ہیں ۔ اپنی ماںتا پر قربان کردے ۔ اور ایسا ناجائز فائدہ اُٹھائے ۔ کہ مجھ جیسے جانور تک لعن طعن کریں؟ بول بول پیاری مادہ کچھ تو بول ۔ ننھے ننھے کلیجوں پر تیر لگانے والی مخلوق ۔ مجروح دلوں پر برچھیاں چلانے والی مخلوق ۔ او دا خسرتا؟ توبہ توبہ!! اے آسمان پر بادشاہت اور زمین پر حکومت کرنے والے! الامان الحفیظ ۔ بچائیو اس مخلوق سے جو اتنی ارذل ۔ اور پناہ میں رکھیو اس فرقہ سے جو اس قدر خودغرض ہو ؛

مادہ ۔ پیاری مادہ! باتوں ہی باتوں میں دن کہیں کا کہیں پہنچا ۔ اور سورج پر آگیا میں نہ کہتا تھا ۔ کہ ایسی منحوس مخلوق کا صبح ہی صبح نام لیا خدا خیر کرے ؛

خواہش یہ ہے کہ آیندہ کسی ایسی شے کا وجود میرے ذہن میں نہ ہو۔
آ اور دامنِ کوہ میں چل جو کچھ کہا کچھ نہیں کہا۔ ابھی بہت کچھ کہنا ہے +
میں اس تماشے میں ایسا محو اور اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا۔ کہ بھوک
پیاس غارت ہوئی۔ ہر چند جی چاہا۔ کہ نیچے اُترو ں اور اپنے پروں کو
ٹھنڈی ہوا سے معصوم دماغ کو تر و تازہ کروں۔ مگر اندیشہ اور اندیشہ کیا
یقین تھا۔ کہ اگر بھولے سے بھی ان حدود میں داخل ہو جاؤنگا۔ جہاں حضرت
انسان کے قدم پہنچتے ہیں۔ تو آزادی کا خاتمہ ہوگا۔ اور بہ قلنچ ہوکر کسی کونے
میں پھینک دیا جاؤنگا۔ اُڑا اور جدھر سُنسہ اُٹھا ادھر کا رُخ کیا جہاں انسان
کی طرف سے اسقدر نفرت آمیز خیالات میرے دماغ میں جگہ پکڑتے جاتے تھے
وہیں تحقیقات مزید کی خواہش اور یقین کی ضرورت بھی اس درجہ محسوس
ہو رہی تھی کہ میں آبادی میں چکر لگاتا رہا۔ گرمی نہایت شدّت سے پڑ رہی تھی
اور چونکہ حرارت آفتاب اس وقت پورے زور پر تھی۔ نازک مزاج انسان
کو اتنی برداشت کہاں؟ کوئی تہ خانوں میں گھسا۔ کوئی خسخانوں میں۔ ہاں
ایک جگہ تین چار آدمی کھڑے دکھائی دیئے۔ ان کو دیکھ کر میں نے بھی طاقتِ
پرواز کو کمزور کیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک موٹا تازہ آدمی جیبوں میں ہاتھ ڈالے
اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ اتنا ہی موٹا مگر عمر میں کچھ چھوٹا ایک شخص جس کی
صورت بڑے موٹے سے بہت ہی ملتی جلتی تھی۔ ایک طرف چپکا کھڑا تھا۔
دو تین آدمی اور بھی تھے۔ مگر مجھے دیکھ کر تو گیا کسی ضرورت ہی سے سمجھنا
چاہئے باہر چلے گئے +

گو پچھلے واقعہ نے اُس چیز کو جو انسانی و شیطانی حرکات میں مابہ الامتیاز ہے۔ دماغ سے قریب قریب غارت کر دیا تھا۔ پھر بھی ایسی اعلیٰ و اشرف مخلوق سے بدظن نہ ہُوا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ انسانی تاریخ کے بدنما دھبے شاید مذہب کے رگڑوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور جو طبیعتیں اصول مذہب جیسی مؤثر شے سے متاثر ہو چکی ہیں۔ ان سے ایسی کمینہ حرکات کا ظہور نہ ہوگا۔ مگر جانور اور مجھ جیسے آزاد کے واسطے یہ تو آسان نہ تھا۔ کہ میں محض انسان کی صورت دیکھ کر یہ پتہ لگا لوں۔ کہ یہ مذہب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ تاہم واقعات پر نظر ڈالنے سے پہلے میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے لحیم شحیم کو اسی غرض سے دیکھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بگلے کا پر سفید ڈاڑھی۔ پیشانی پر بل۔ گٹے ٹخنوں سے اونچا پائجامہ۔ مختصر یہ کہ کچھ ایسا تقدس ٹپک رہا تھا۔ کہ میرے دل نے بلا تامل اس شخص کے انسان ہونے کی شہادت دی۔ میں منتظر تھا کہ اس کے قول و فعل سے کس طرح واقفیت حاصل کروں۔ دفعتہً اس بڑے موٹے نے چھوٹے موٹے سے کہا:-

"یہ صرف فتنہ پردازوں کی شرارت ہے۔ جو تم کو میری طرف سے بھڑکا رہے ہیں۔ میں اگر تمہارا دشمن ہونگا۔ تو دوست کس کا ہونگا۔ یہ دولت اور ریاست سب مل جانے والی چیز ہے۔ مگر تم جیسا برابر کا بھائی۔ نہ ماں باپ زندہ ہو کر آئینگے۔ نہ نصیب ہوگا۔ صدقہ کر دوں تم پر سے وہ جائداد جو تمہارے دل میں میری طرف سے گرہ ڈالے۔ بھائی سلیم! تم نے کس طرح یقین کر لیا۔ کہ میں حکام کو تمہاری بغاوت کا یقین دلا رہا ہوں۔ اور اس کمبخت موضع عزیز آباد

کے واسطے! لاحول ولاقوۃ! اگر خدا کوئی چیز ہے۔ اور مرنے کے بعد اُس کے حضور میں افعال دنیوی کا جواب دینا ہے۔ تو میں اس کو شاہد کرتا ہوں کہ اگر تم سے دغا کروں تو خدا سے۔ تم بلا تامل اس دستاویز پر دستخط کردو۔ واللہ باللہ قسم باللہ اس کو میری بدنیتی پر محمول نہ کرو۔ تمہاری ریاست تمکو مبارک ہو۔ میری یہ کوشش دوراندیشی پر مبنی ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ ایسی ویسی ہو تو یہ آبائی نشانیاں جہاں باپ دادا کی ہڈیاں گڑی ہوئی ہیں نیست و نابود نہ ہو جائیں"۔ باپ دادا کا نام لیتے ہوئے اُس شخص کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور کچھ ایسے درد سے تقریر کی کہ چھوٹے موٹے نے فوراً ہی دستخط کر دیئے۔ نہ معلوم اس کاغذ میں کیا خدائی کی دولت تھی۔ کہ دستخط ہوتے ہی بڑا موٹا باغ باغ ہو گیا۔ اور کاغذ ہاتھ میں لے یہ جا وہ جا۔ ابھی اس شخص کو گئے مشکل سے ایک گھنٹہ ہُوا ہوگا۔ کہ چند طاقتور انسان رنگ برنگ کی وردیاں پہنے دھڑا دھڑ گھس آئے۔ اور اس چھوٹے موٹے کو زنجیروں میں جکڑ ایک طرف لے چلے۔ اس شخص کی گریہ وزاری اور اظہار بیگناہی پر کلیجہ کٹتا تھا۔ زمین پر یہ چھوٹی سی جماعت اور ہوا پر میں اکیلا۔ مختصر یہ کہ ہم سب ایک ایسی جگہ پہنچے۔ جو عدالت کے نام سے تعبیر کی جاتی تھی۔ سب سے پہلا شخص جس نے اس مظلوم کے باغی ہونے کی شہادت دی وہی بڑا موٹا تھا۔ بس پیاری مادہ جانے دے میں نے تیرے ننھے سے دل کو بہت تکلیف پہنچائی۔ ایسا نہ ہو اس قسم کے واقعات تیری صحت پر بُرا اثر کریں حقیقی بھائی سے زیادہ دوست کون ہو سکتا تھا۔ اس شخص کو جلاوطنی کا حکم ہُوا جس وقت اُس کو کشاں کشاں لے

چلے ہیں۔ وہ نہایت حسرتناک وقت تھا۔ قیدی نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ اور کہا " بھائی جان! موضع عزیز آباد میرے پاس رہا نہ تمہارے پاس رہیگا۔ چار دن کی زندگی کے واسطے تم نے مجھ سے میرے پیارے چھڑوائے ہیں تو بھلا لیکن اب تم اس جگہ چلنے کے واسطے تیار رہو۔ جہاں میرا تمہارا انصاف ہوگا۔ اور جہاں میری شکایت کے بغیر اس کا فیصلہ ہو جائے گا "۔

بتا پیاری کچھ تو بتا کیا اب بھی تو اس مخلوق کے ہمسایہ میں رہنا پسند کرتی ہے؟ وہ دن اور آج کا دن میں نے تو عہد کر لیا کہ آبادی کی طرف رُخ نہ کروں گا۔ لیکن کل شام کو میں نے یہاں بھی حضرت انسان کی صورت دیکھی۔ بس اُڑ اور چل وطن کو خیر باد کہہ۔ اور عزیز و اقارب کو خدا حافظ۔

دیور بھاوجوں کی خط و کتابت

جو چچا زاد بہن بھائی بھی ہیں

بھاوج کی طرف سے

میرے نہایت عزیز صغیر۔ یوں تو کئی دن سے ارادہ کر رہی تھی۔ کہ تمہاری سسرال جاؤں۔ اور صغیر دلہن سے ملوں۔ مگر کل محض اتفاق سے وہ ارادہ پورا ہو گیا۔ ملو سچ یہ ہے۔ کہ یہ ملاقات ہی اس خط کے لکھنے کا باعث ہے۔ یہ تو تم سن چکے ہو گے۔ کہ ہماری خوش قسمتی سے آجکل لیڈی لیس یہاں رونق افروز ہیں۔ لیڈی صاحبہ کو جو اُنس و محبت ہندوستانی عورتوں سے ہے۔ اس کا شکریہ میں کیا کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا۔ خاتون موصوف مغربی تعلیم و تربیت کا وہ نمونہ ہیں جس میں طرزِ معاشرت کے اثر نے خلوص و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ میں بہ حیثیت کلب کی پریزیڈنٹ ہونے کے اپنا فرض سمجھتی تھی۔ کہ اس معزز مگر منکر لیڈی کو شہر کی معقول خواتین سے انٹروڈیوس کراؤں۔ اور ایک نسوانی پارٹی میں سب کو مدعو کر کے یہ دکھا دوں کہ مشرقی عورتیں بھی تہذیب و انسانیت سے آشنا ہیں۔ وہ بھی پہلو میں دل رکھتی ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی جذبات فطرتی موجود ہیں۔ پردے نے ان

کی زندگی کو ایک راز بنا دیا ہے۔ اور اس راز میں جو بدنما دھبے بیرونی سطح پر نظر آرہے ہیں۔ وہ محض پردے پر زور دینے والوں کی عنایت ہے ٭
اس ہی سلسلے میں مَیں منیر دُلہن سے ملنے گئی۔ لیکن اُن کی گفتگو سُنکر مجھے تعجب ہی نہیں سخت افسوس ہُوا۔ چونکہ تمہاری اجازت نہ تھی۔ اس لئے اُنہوں نے انکار کیا اور میں اپنا سا مُنہ لے کر چلی آئی ٭
آج میں اس مسئلہ پر تم سے بحث کرتی ہوں میری رائے میں تم نے خاوند ہونے کا یہ نہایت ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ کہ اپنی بیوی کے ہر قول و فعل یہانتک کہ ملنا جلنا۔ آنا جانا۔ غرض ہر چیز کو اپنی رضامندی پر منحصر کیا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو۔ کہ تم کو خاوند ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی حکومت کا کیا حق حاصل ہے؟ تم جانتے ہو۔ عورت کیا شے ہے؟ بیوی کے کیا معنے ہیں؟ اور ایک عورت کے نکاح میں آکر تم پر کیا حقوق واجب ہو گئے؟
تم مجھے معاف کرنا اگر میں یہ کہوں۔ کہ عورت کے وضع کرنے میں فطرت کا جو منشا تھا وہ تمہارے ہاتھوں پورا نہ ہُوا۔ اور تم جیسے خود غرض بندۂ نفس مردوں کے قبضے میں آکر عورت کی وقعت و عزت سب خاک میں مل گئی۔ تم لوگوں نے بدظنی کے تیروں سے عورت کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ حکومت چونکہ تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے جب وہ باقی نہ رہی تو تم نے بیویوں پر حکومت کرنی شروع کی۔ نیچر نے تم کو صرف تحصیل معاش کے واسطے قوی و زبردست بازو دیئے تھے۔ لیکن تم نے ان سے مخلوق پر بھی حکومت کرنی شروع کی جو اکثر اعتبار سے تمہارے برابر اور بعض معاملات میں تم سے بدرجہا بہتر تھی ٭

پردہ محض تمہاری بدگمانی کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔ تم نے صرف اس خیال سے کہ ان کو دنیا کی ہوا نہ لگے۔ ان کی آنکھیں چار نہ ہوں۔ کچھ اس طرح قید کیا۔ کہ سب کی سب تمہارا ہی کلمہ پڑھنے لگیں ÷

تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ دیکھو اور بتاؤ کوئی ملک۔ کوئی فرقہ کوئی قوم عورت پر ایسا جبر کر کے ترقی کر سکی؟ دُور کیوں جاؤ صرف اسلام کو لو۔ آج بھی اسلامی ممالک میں شرمی پردہ رائج ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی چلتی ملتی جُلتی ہیں۔ وہ مردوں کی دستِ نگر ہوں۔ محکوم نہیں۔ ان کی بے وفائی کی شاکی ہوں۔ مگر مظلوم نہیں ÷

تم کو نہ اس سے انکار ہونا چاہئے۔ نہ ہوگا۔ کہ عورت کا وجود محض مرد کی زندگی کو پُر لطف بنا دینے کے واسطے ہے۔ جس وقت دماغ دن بھر کے افکار سے پژمردہ و پریشان ہوتا ہے۔ اس وقت اُس کی ایک ہنسی وہ ہنسی جس میں بہت سے راز پنہاں ہیں۔ اُس کی مسکراہٹ وہ مسکراہٹ جس کے ساتھ نگاہ کی شوخی اور شرارت شامل ہے۔ تمام آلام کو زائل کر دیتی ہے۔ وہ اپنی تلخیاں کو بھول جاتا ہے۔ شاعری۔ موسیقی۔ غرض وہ مادہ جو قدرت نے عورت کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے۔ تھپک تھپک کر مرد کے رنجیدہ تخیلات کو علیحدہ کر کے دماغ میں مسرت و شوق کی تہ بچھا دیتا ہے ÷

عورت ایک پھول ہے جو مرد کے چمنستان حیات کو اپنی خوشبو سے مہکا دیتی ہے۔ گو مردوں کی بدولت اس کے اصلی جوہر کھلنے نہ پائے۔ اور یہ بند کلیاں شگفتہ ہونے سے پہلے ہی مرجھا گئیں لیکن پھر بھی اس پھول کی

بھینی بھینی خوشبو نے ان کی عمروں کو معطر کر دیا۔ اے کاش ان کلیوں کی قدر ہوتی۔ ان کو پانی ملتا۔ قدر دانی کے ساتھ ان کو سینچتے۔ تو یہ ناقص العقل فرقہ اتنا مہکتا۔ کہ رستہ چلتے درود پڑھتے۔ اور تم لوگ دیکھتے۔ کہ دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں ÷

ضمیر میاں بُرا نہ ماننا۔ تم نے ان پھولوں کو پاؤں سے رُوندا۔ یہ پنکھڑیاں اس قابل نہ تھیں۔ کہ تم ان کو مسل کر پھینک دو۔ عورت وہ چیز تھی۔ کہ اگر تم اس چیز کی قدر کرتے۔ تو یہ تم کو معراج کمال پر پہنچاتی۔ تم کندن نہیں لالوں کے لال ہوجاتے ÷

آخر تم مجھے بتاؤ تو سہی۔ عورت پر حکمران ہونے کا خبط تمہارے دل میں سمایا کہاں سے؟ میں بھی سُنوں تمہارے پاس ایسے کیا حقوق ہیں جو تم ان بے زبانوں پر سلطنت کرو۔ میں سچ کہتی ہوں تم نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ یہ صرف عورت ہی پر حکومت کرنے کا نتیجہ ہے۔ کہ اصلی حکومت کھو بیٹھے۔ اس جنون نے فقیر بنوا دیا۔ بھیک منگوا دی۔ جو محلوں کے رہنے والے تھے۔ ان کو جھونپڑا نصیب نہیں۔ اور جن کے لباس قاقم و سنجاب تھے۔ آج پیوند لگائے پھر رہے ہیں ÷

وہ ہادی برحق جس کو تم پیغمبر اسلام یقین کرتے ہو جس کو سچا نبی اور پاک رسول مانتے ہو۔ اس کے اقوال پر نظر ڈالو۔ تم کو معلوم ہوجائے گا۔ کہ عورت کی وقعت رسالتمآب کی نگاہ میں کتنی تھی۔ کیا تم تک یہ الفاظ نہیں پہنچے۔ کہ عورت اور خوشبو دو چیزیں مجھ کو دنیا میں زیادہ محبوب ہیں۔ ضمیر!

مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ مسلمان جب تک اپنی عورتوں کی قدر کرتے رہے اُن کا سکہ تمام دُنیا میں بیٹھا۔ لیکن جس روز سے اُنھوں نے اس قابل قدر فرقے کو ذلیل کیا۔ اُن کی ہوا اُکھڑ گئی ؎

ایک خالق کی مخلوق ایک خدا کے بندے۔ ایک دنیا کے رہنے والے ہمارے فرائض الگ تمہارے فرائض الگ۔ تم کو ہم پر حکومت کرنیکا حق کیا؟ تم ہمارے حقوق سے لاپروا ہوئے۔ جانوروں کی طرح ہم کو قید رکھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ ہم جانور تھے۔ ہم نے جانور جنے۔ جانور پلے اور اگر آج تمہیں جانور کہیں تو کیا گناہ ؎

آخر مغربی عورتیں بھی تو بیویاں ہیں۔ ان کے ہاں بھی خاوند ہوتے ہیں۔ دیکھو وہ ملک کیسی ترقی کر رہا ہے۔ تہذیب کا مرکز۔ شائستگی کا گھر۔ ہم نے بہت روز تک تمہاری اطاعت کی۔ اب وہ دن ہوا ہوئے۔ کہ ہم گھٹ گھٹ کر مریں۔ تمہاری چلمیں بھریں۔ تمہارے پاؤں دبائیں کہیں جائیں تو تم سے پوچھ کر کسی سے ملیں تو اجازت لے کر۔ کھائیں تو صلاح سے۔ بیٹھیں تو مشورے سے۔ غرض ہماری نشست برخاست حرکات سکنات سب تمہاری مرضی کے تابع ہوں ؎

پیارے صغیر! صغیر دُلہن کا یہ جواب کہ "میں کسی جگہ بغیر اُن کی اجازت کے نہیں جا سکتی"! نہایت معقول تھا۔ بیوی کو چار دیواری کے پنجرے میں قید نہ کرو۔ اس کو دکھاؤ کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ گو تمہاری صحبت نے اُس کی طبیعت متوحش کر دی۔ لیکن وہ قدرت سے ایسا مادہ لے کر آئی ہے جو صرف

تھوڑی پرداخت کا محتاج ہے۔ دنیا دیکھنے دو۔ زمانہ طبیعت کو آپ ہی درست کرو یگا۔ علم سے مستفیض ہونے دو۔ سوسائٹی میں شریک کرو پھر دیکھنا۔ کہ یہ پردے کی بیٹھنے والیاں جن پہ ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی ہے۔ بڑے حکما کے کان کترنے لگیں گی۔

مجھے اندیشہ ہے میری تحریر۔ تم کو ناگوار نہ گزرے۔ اب میں ختم کرتی ہوں۔ مگر اتنا اور کہتی ہوں۔ میری اس بات کو یاد رکھنا۔ اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے تو عورتوں کے حقوق واپس کر دو۔ اور وہ کام کرو کہ آنے والی نسلیں دعائیں دیا کریں۔

دیور کا جواب

بجو بہن! خط تھا یا برسوں کا بخار۔ حرف تھا۔ وہ چنگاری اور جو لفظ تھا۔ وہ شرارہ۔ لیڈی لین آئیں تو تمہیں بھاگ۔ اور ٹی پارٹی دی تو تمہاری سہیلیوں کو مبارک۔ بھلا ہم بیچارے غریب سوکھے ٹکڑے تو نصیب ہوتے نہیں۔ پلاؤ قورمے کھائیں تو کس منہ سے؟ تم نے لیڈی صاحبہ کی دعوت کی خوب کیا۔ صغیر دلہن شریک نہ ہوئیں بہت خوب کیا۔ تم ماشاءاللہ چھٹری تھیں جو کچھ کرتیں کم۔ وہ غریب آدھی درجن بچوں کی ماں۔ ایک گود میں ایک پیٹ میں۔ اٹھنا مشکل بیٹھنا دوبھر۔ ہنسی اڑوانی ہوتی تو جاتی۔ تمہیں بچوں سے نفرت۔ وہ بچوں پہ چھڑکے جان۔ تمہارا اس کا میل کیا۔ تم اللہ رکھے تحصیلدار کی بیٹی ضلعدار کی بیوی۔ جو کرو سب زیب۔ وہ بیچاری ملانی مسجد کے ٹکڑوں سے پلی۔ زکوٰۃ میں بڑھی۔ بیاہی آئی تو یہ پتھر پڑے کہ بیس روپیہ اور نو بندے۔ اسکے بھاؤیں کلکٹر اڈے تو رہے تو اسے سب یکساں تم ہی سوچو سچ ہے

یا جھوٹ۔ اس کو تو پہلی پٹنی شکل ہوتی ہوگی۔ گاڑی کے آٹھ آنے تو بچوں پر
روفاقے ڈال دیتے۔ اور اگر محض شرما شرمی گھیرا چیکی کی جاتی بھی۔ تو کیا گیارہ
مہینہ کا بچہ نئے لوگ اوپرا گھر۔ بیسیوں بیویاں۔ اسے تو کلب جیل خانہ ہو جاتا۔
ماں غریب کلب دیکھتی یا بچہ بہلاتی؟ نصیر مہینہ بھر کا دودھ چھٹا ماں کے بغیر تو
ٹکنے سے رہا۔ دو قدم آگے ہی ہوتا۔ وہ ایک ضدی اس سرے سے جو لوٹ
لگاتا تو اللہ جانے فرش میں لپٹا ہوا اُس کنارے پہنچتا۔ تو بتاؤ تم ہی بتاؤ اس
کو سنبھالتی اُس کو چمکارتی کلب دیکھتی۔ بیویوں سے ملتی! بہن یہ تو پیٹ بھرے
کے سودے اور چھڑی چھٹانکوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ خدا شاہد مجھے بیچ میں تمہاری
کوششوں کا مخالف نہیں۔ تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا اور خوب کیا۔ اور کرنا چاہیے
تھا۔ مگر ہر کام کا ڈھنگ اور ہر بات کا موقع ہوتا ہے۔ ہمبری کی متوقع ہو
تو اُن سے جو ارادہ کریں۔ اور کر سکیں۔ یہ نہیں کہ کیا اور کر نہ جانا۔ میں ہوتی
تو کرو کھاتی تمہیں خدا کی قسم اب کے جلسہ میں ذرا یہ تو پوچھنا۔ کہ لکچر اسپیچیں دینے
والیاں کے کے بچوں کی مائیں ہیں؟ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا۔ اگر ایک آدھ
نکل بھی آتی۔ تو پھر نوکر گنتا۔ خدمتگار گنتا۔ جن بیچاریوں کی اپنی ہی پوری نہیں پڑتی
وہ نوکر رکھیں کس برتے پر؟ گھر کی جھاڑو بہارو۔ میاں کا آگا تاگا۔ چولہے
کی ہنڈیا ڈوئی۔ کیا کریں۔ کیا نہ کریں۔ بچے پالیں کلب پہنچیں۔ خفا نہ ہونا میں
معترض نہیں۔ ایک فرقے کی طرف سے مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں مغربی خواتین
کی مثال نہ لو۔ بڑے آدمی بڑے لوگ۔ کجا گنگا تیلی کجا راجہ بھوج۔ انہیں
روپیہ کی کیا کمی۔ ملک ان کا۔ حکومت ان کی۔ عزت ان کی۔ دولت

ان کی۔ جو چاہیں کریں۔ جہاں چاہیں پھریں۔ یہاں نہ چولھے آگ۔ نہ گھڑے پانی و پیٹ میں پڑتی ہے۔ تو سب سوجھتی ہے۔ جن بیویوں پر مُنہ آ رہی ہو۔ یہ بھی تمہارے ہی جیسی عورتیں ہیں۔ تمہاری جتنی عقل تمہاری جتنی ہمدردی ان میں بھی ہے۔ جانور نہیں۔ یہ بھی آدمی ہیں۔ مگر کیا کریں مفلسی نے وہ عقل اور ہمدردی سب خاک میں ملا دی۔ چلو خیر خدا کا شکر ہے۔ ایک جماعت تو ہم میں بھی ایسی نکل آئی۔ عقل میں بھرپور۔ قومی دُھن میں چکنا چور۔ بچّہ نہ کچّا۔ کرنا نہ دھرنا ⁂

اب میں تمہارے خط کا جواب دوں۔ طرز تحریر نہایت خوب۔ خیالات کی بلند پروازی چشم بددور۔ جدّت قابل تحسین اور ہمّت لائق شاباش۔ تمہارے پاس اس یقین کی کیا وجوہ ہیں۔ کہ مشرقی خواتین ہماری رائے میں ارذل المخلوقات ہیں۔ کس نے کہا۔ اور کب کہا جس نے کہا جب کہا اور جس کے سامنے کہا۔ غلط اور یقیناً غلط۔ فطرت کی تقسیم میں کمی بیشی تو ممکن ہے لیکن آسمان زمین کا فرق جو کہے وہ بے وقوف۔ جو سمجھے وہ کودن۔ ہمارا ایمان یہ ہے۔ کہ یہی چار دیواری میں بیٹھنے والیاں اگر زیور علم سے آراستہ ہوں۔ تو اُن کے مُنہ سے ایسے پھول جھڑیں۔ کہ مغرب بھی اس خوشبو پر لٹو ہو جائے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو۔ کہ ہمارے ہیں طبقۂ اناث پر انسانیت کا اطلاق جائز نہیں۔ گو فریقین میں تھوڑا سا امتیاز قدرت نے رکھا۔ اور نظام عالم مقتضی تھا۔ کہ یہ امتیاز رہے۔ تاہم نہ یہ ہمارا یقین نہ ایمان۔ نہ رائے نہ خیال۔ کہ یہ تفریق اس

حد تک پہنچ گئی۔ کہ عورتوں کی طبیعتیں ایسے مادّے سے محروم ہیں جو علم سے متاثر ہو سکے لیکن وقت امرض لا علاج ہے۔ ضرورت نے کیا مجبور۔ افلاس نے چھائے ڈیرے۔ مقاصدِ حیات محدود رہ گئے۔ زن و شوہر کے اتصال کا ماحصل یہ ٹھیرا کہ دونوں زندگیاں باطمینان ختم ہو جائیں۔ اور اگر میری رائے غلط نہ ہو۔ تو میں کہوں گا۔ اور علی الاعلان کہوں گا۔ کہ یہ اصول مقدم ہونے کے قابل بھی تھا۔

تمہارا سوال ہے۔ کہ مجھ کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ صغیر دلہن کو کہیں جانے کے واسطے اپنی اجازت کا محتاج رکھوں۔ تمہارا یہ اعتراض صحیح ہے یا غلط مگر مجھ پر نہیں قدرت پر ہے۔ قدرتاً عورت اس طرح پیدا کی گئی ہے۔ کہ وہ مرد کی خفیف سی نگرانی میں کام کر سکے۔ جن قوموں نے اس اصول کو نظر انداز کیا۔ وہ ہرگز کامیاب زندگی بسر نہ کر سکیں۔ واقعات پیش نظر ہیں۔ منہ نہ کھلواؤ۔ خود ہی سوچو اور آپ ہی غور کرو۔ فطرت نے جیسا کہ تم خود ہی کہتی ہو عورت کی طبیعت میں وہ اسباب رکھ دیئے ہیں۔ جو ایک مرد کا دل مسخر کرنے میں اور اس کا دل راغب کرنے میں ہر وقت اور ہر حال میں مددگار ہیں ضرورت صرف اتنی ہے کہ مواقع اجازت دیں نہ نظارہ۔ اس کے بعد گفتگو اور پھر میل جول وغیرہ وغیرہ۔

کیا وہ شے جو فطرتاً یہ تمام سامان ساتھ لے کر آئی۔ اس بات کی محتاج نہ تھی۔ کہ اگر اس کی یہ کامیابی معیوب ہے تو اس کے لمحات پر نگاہ رکھی جائے؟ اگر کوئی عورت بحیثیت بیوی ہونے کے کسی غیر جلسہ میں شوہر کی اجازت ضروری

سمجھتی ہے۔ تو وہ کس گناہ کی مرتکب ہے؟ گو یہ تسلیم کرنے کو میں بھی تیار نہیں ہوں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں۔ نہ انصاف مجھے یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہر مرد ہر عورت سے عقلمند ہے لیکن اس سے تمہیں بھی انکار نہ ہوگا۔ کہ بیویاں جب تک تعلیم کی اس حد پر نہ پہنچ جائیں۔ جہاں خاوند ہیں۔ وہ ان کی اصلاح اور مشورے کی یقینی محتاج ہیں ؛

بدظنی۔ توبہ توبہ۔ نعوذ باللہ! تم بھی کن فرقوں کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ اگلے زمانہ کی تو میں کہتا نہیں۔ کیا تعجب ہے ایسے بھی ہوں گے لیکن اب تو کوئی ایسا ہی بے غیرت ہوگا جو بیوی جیسی رفیق سے بدظن اور عورت جیسی مونس سے بدگمان ہو میل کا بیل۔ رائی کا پربت۔ تل کا پہاڑ۔ مکھی کا ہاتھی۔ صد آفرین تمہاری طبیعت کو۔ جو سمجھ میں آیا وہ لکھ بیٹھیں۔ باتیں کیں تو وہ کچھ خط لکھا تو یہ کچھ عجوبہ بہن! تم تو سچ مچ ہی کی عجوبہ نکلیں۔ جو اصل بات ہے۔ وہ تم نہ کہو میں کہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہوں۔ واقعات آنے سامنے جھگڑے ہوئے پیدا۔ اندیشہ ہونا ہی تھا جب امکان کا اندیشہ ہے۔ تو انسداد خطا کیلئے اور گناہ کیوں؟ اب اس انسداد کو بدظنی کہو۔ بدگمانی سے تعبیر کرو۔ جو چاہو سمجھو یہ وہی انسداد ہے۔ جو پردے کی صورت میں سامنے آیا۔ تم نے پردہ شرعی کو لیا تو یوں ہی سہی۔ یہ کس کی سنی سنائی کہہ رہی ہو۔ تم نے تو سنا ہوگا۔ یا پڑھا ہوگا مجھ سے پوچھو کہ مہینہ دو مہینے اکٹھے تین سال ممالک اسلامیہ میں گزار آیا۔ عجوبہ بہن! یہ پردہ شرعی کی آڑ وہ پکڑتے ہیں۔ جو پردہ پسند نہیں کرتے بچی ہو عقل کی کچی ہو۔ اتنا تو سوچو۔ پردہ شرعی وہاں ہے۔ جہاں قانون بھی

شرعی ہے۔ مجال ہے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے تو دیکھ لے۔ تمہارے ہاں تو اگر
ایک گھر سے دوسرے گھر ڈولی جائے۔ تو رستے میں دو ہزار گالیاں کانوں
میں آئیں گی۔ میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں۔ کہ قدرت کے انعام
میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ عورتوں کو بھی کائنات سے
محظوظ ہونے کا وہی حق حاصل ہے۔ جو مردوں کو۔ اور اگر ایک بیوی خاوند
کی اجازت و صلاح سے تفریح و دلچسپی کے سامان ایسے پیدا کرے جو اس
کے فطرتی جوش کے واسطے برائی کی طرف محرک نہ ہوں۔ تو قطعی جائز ہے

یہ مسلمہ اصول اور مقررہ قانون ہے۔ کہ انسان حالت موجودہ میں قانع
نہیں ہوتا۔ اور ہر جدت میں لذت ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہوئی ہے۔ اس امر کی
کہ تم مغرب کی اس قدر دلدادہ ہوئیں۔ لیکن تم تو تم۔ میں کہتا ہوں خدا دشمن
پر بھی مغرب کا پرچھاواں نہ ڈالے۔ خدا نہ کرے کہ ہم وہ دن دیکھیں جب
ہماری عورتوں کا مقصد حیات اپنے شیدا پیدا کرنا ہو۔ گو ہمارے ہاں بعض ایسے
کمبخت بھی موجود ہیں۔ جن کے وجود سے یہ کلنک کا ٹیکا ہمارے ماتھے پر لگا۔
اُنہوں نے درحقیقت عورت کی قدر و منزلت میں انصاف نہ کیا۔ لیکن کیا
مغرب میں ایسے لوگ موجود نہیں۔ جنہوں نے بیویوں کی زندگیاں چھین
ہی نہیں بلکہ ایسی برباد کیں۔ کہ مظلوموں نے روتے ہی روتے بسر کی؛

اصول پر نظر ڈال کر دیکھو۔ تو میں مدعی ہوں۔ اس اعلان کا کہ جو قدرت
ہم نے اپنی خواتین کی کی۔ مغرب کے فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ ہم نے اگر
اُن کے علمی خلعت چھین لئے۔ تو مجبوری اور معذوری سے۔ لیکن اُن کو عفت و

عصمت کے ایسے گجرے پہنائے جو قیامت تک مرجھانے والے نہیں۔ اس حسرت و ذلت۔ اس فقیری و ناداری میں ان موتیوں کی آب پر حرف نہ آنے دینا۔ ہمارا ہی کام تھا۔ رہا علم سے محروم رکھنا۔ یہ ہماری مجبوری بھی تھی اور غلطی بھی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہ ہوں گے۔ کہ ہم نے قدر نہ جانی۔ مجھے اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں۔ کہ ان کو علم سے محروم رکھنے میں ہم نے ان کو کیا اپنے تئیں سخت نقصان پہنچایا۔ اور اب اس کی تلافی کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن یہ تو میں کبھی نہ کہوں گا کہ اندھا دھند مغرب کی تقلید پر ہم کمربستہ ہو جائیں۔ اور اُن کے ہر قول و فعل کو سر آنکھوں پر رکھ لیں۔ یہاں تک کہ عفت و عصمت۔ شرم و حیا۔ بچوں کی لاج۔ باپ دادا کی عزت۔ سب نظر انداز ہو جائے۔

پردے کا ذکر چھیڑ کر تم نے میرے پکے پھوڑے میں ٹھیس لگا دی۔ آہ عجوبہ! یہ تو مسلمانوں سے رخصت ہؤا۔ آج نہ ہوا۔ تو کل ہؤا۔ یہ تو اب رکتا نہیں۔ یہ جوان شیر دم توڑ رہا ہے۔ اور کوئی دم میں رخصت ہؤا۔ نعمت تھا۔ یا مصیبت جو کچھ بھی۔ کوئی دن کا مہمان سمجھو۔ پچاس برس کے اندر ہی اندر اس کا خاتمہ ہی سمجھ لو۔ خدا کرے تمہارا خیال سچا ہو۔ اور اس وقت کے لوگ تمہیں دعا دیں۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو میں یہ کہوں گا کہ آنے والی نسلیں سر پیٹ لیں گی۔

نند کا خط بھاوج کے نام

شاباش چھوٹی دُلہن شاباش! اسی دن کو بیٹے کا ارمان کرتے ہیں۔ کہ بہو آن کر کتّے کے ٹھیکرے میں پانی پلاوے! اللہ رکھے ایک چھوڑ دو دو بیٹوں کی ماں ہو۔ ایک دن تم کو بھی ساس بننا ہے۔ ڈرو خدا سے اُسکی لاٹھی بے آواز ہے۔ جیسی تم نے ساس کی مٹی پلید کی خدا دشمن کی بھی نہ کرے! چھوٹی دُلہن! بہن مظلوموں کی فریادیں یوں ہی خالی نہیں جاتی۔ اور پھر ماں۔ آہ! میری آج کی بات یاد رکھنا۔ اماں کا صبر اوپر ہی اوپر جانے والا نہیں۔ دنیا اور دین دونوں برباد ہو گئے۔ وہ بڑی ساس ہی نہ تھیں۔ سر کا سرپوش۔ جھاڑو کا بندھن۔ اماں کی زندگی ایسی نعمت تھی۔ کہ اگر لاکھ روپیہ بھی خرچ کر ڈالو تو ہاتھ آنے والے نہیں۔ دونوں میاں بیوی سر پر ہاتھ رکھ رو ؤ گے۔ اور پچتاؤ گے۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اور ہر لحظہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی دعا گو تھیں۔ بوا! یہ صرف مامتا ہی کا جوش تھا۔ کہ پیر کی رات کو بھی جب ہوش آیا تو بلبلا کر دعا مانگی،

" الٰہی سعید[۱] اور اُس کی بیوی بچوں کے واسطے دنیا کی خوبیاں " تمہارے کوسنے اور فضیحتیاں کلیجہ پر تیر لگتے تھے۔ مگر خدا گواہ ہے۔ جب

---

[۱] چھوٹی دُلہن کے میاں کا نام ہے۔

کہا یہ ہی کہا:۔

"اے اللہ حمیدہ[1] دلہن اگر اسی طرح زبان نہ چلائے۔ او میرا بدلہ لے" چھوٹی دلہن سچ پوچھو تو دعا کا دروازہ بند ہوگیا۔ کچھ ہی کر ڈالو۔ اب اُس دل سے دعا دینے والا کوئی نہیں۔ تم کو سو۔ وہ نہیں تم خفا ہو وہ دعا دیں۔ اتنی سی بات پر کہ رشید باسی چاول کھا رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ کہ میٹھی دن خراب ہیں" تم دونوں میاں بیوی ان کی جان کو آ گئے۔ ہائے چھوٹی دلہن جس وقت تم نے کہا ہے "مریں بھی تو نہیں" اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھیں آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں۔ اور کہہ رہی تھیں۔ میں اسی دن کے لئے اسکو لائی تھی۔ کہ یہ میرا مرنا چاہے۔ مامتا اس کی۔ بچہ اس کا۔ دادی بندی کے منہ میں خاک۔ میری تو پہلے ہی ست پرست جان ہے۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی ہوں۔ کہ اماں باوا کی سلامتی میں دونوں بھائیوں کی جوڑی قائم رہے۔ دلہن مجھ کو دشمن سمجھتی ہے۔ خیر میں دشمن ہی سہی +

صد آفرین بھائی سعید کو۔ پڑھے لکھے معزز شریف اور ماں کی وہ قدر کی کہ آج کوئی لونڈی کی بھی نہ کرے گا۔ مامتا تو خیر سب ہی کو ہوتی ہے۔ مگر وہ تو پروانہ تھیں۔ ہر وقت کہتی تھیں۔ "میرا بچہ اللہ کی سپردگی میں ہے" بیوی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے گھنٹوں سجدے میں پڑی رہتی تھیں۔ تم دونوں کو تو خط بھیجنا قسم تھا۔ غیروں سے خیریت معلوم کرتی تھیں۔ ذرا دیر ہوتی تھی۔ تو دیوانوں کی طرح پھرتی تھیں۔ ایسی عاشق زار ماں اسی کی

[1] چھوٹی دلہن کا پہلونٹی کا لڑکا۔

مستحق تھی۔ کہ بیٹا بھر منہ کہہ دے ”اب تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے مرنے پر آئیں گے“

اسی دن کے لئے بچوں کو پالتے ہیں۔ اسی دن کے لئے اللہ آمین کرتے ہیں۔ اب بھی دو چار بیویاں اس وقت کی دیکھنے والی موجود ہیں۔ کہ مرنے والی نے کیسی محنت مصیبت اُٹھا کر میاں سعید کو جوان کیا ہے۔ پرسوں خالہ مریم کہہ رہی تھیں۔ کہ اس نا اتفاقی میں میاں نے کبھی بات نہ پوچھی بچے کو اس طرح پالا کہ محلہ بھر واہ واہ کرتا تھا۔ سارا کنبہ جانتا ہے۔ کہ کبھی کسی نے میاں سعید کو بُرے حالوں نہ دیکھا۔ اپنا دوپٹہ جکٹ۔ کُرتہ میلا کچھ بھی ہو مگر بچہ جب باہر نکلا۔ اُجلے کپڑے۔ ثابت جوتی۔ ذرا مدرسہ میں دیر ہو جاتی تھی تو دروازے میں جا کھڑی ہوتیں۔ اور جو آتا اُسی سے پوچھتیں:۔

”کیوں بھائی میرے سعید کو تو نہیں دیکھا“

آہ! چھوٹی دلہن اماں کی محنت کا اچھا پھل نہ ملا جس بیٹے کے واسطے آپ خاک ہوئیں عیش و آرام سب مٹی کیا۔ پالا پوسا۔ پڑھایا۔ لکھایا۔ اُس کو زندہ تو نہ زندہ مر دے پر بھی آنا نصیب نہ ہوا۔ بیٹے کی کمائی میں ماں کی تقدیر کا ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ تمہاری لونڈیاں اور مامائیں سفید براق کپڑے پہنے پھریں۔ اور ساس کے پاس برس کے برس دن بھی اُجلا کپڑا نہ ہوا۔ خدا کی قسم کلیجہ کٹتا ہے جس وقت خیال کرتی ہوں۔ کہ سارے سارے دن خالی زردہ کھایا اور بیٹے کی شکایت زبان پر نہ آئی۔ کیسی جنتی بیوی تھیں جب بڑے ماموں جان نے پچاس روپے بھیجے تو سُن کر ہنسیں اور ہنس کر کہا

میرا بچہ تحصیلدار ہے۔ اُس کو تین تین بیٹیاں بنجنی[1] ہیں۔ روپے لے لوں۔ تو اُس کی ناک کٹ جائے گی۔ اللہ اُس کی عمر میں برکت دے میں کیا کسی کی محتاج ہوں۔ کیسی صبر کی آدمی تھیں۔ فاقہ فقر تنگی ترشی ہر حال میں راضی ہر بات میں خوش۔ مرگئیں اور فاقے کر کر کے مریں۔ مگر گھر کی ہوا نہ بگڑنے دی۔ میاں سعید سے کہہ دینا جس ماں کے مرنے کا ارمان تھا۔ وہ چار ہزار کا مکان تمہارے واسطے چھوڑ گئی۔ تحصیلداری سدا رہنے والی نہیں۔ ایک دن خدا کو مُنہ دکھانا ہے۔ جس شخص کے دروازے پر آٹھ آٹھ دس دس آدمی موجود ہوں۔ اُس کی ماں کے پاس آخر وقت کوئی حلق میں پانی ٹپکانے والا نہ ہو۔ بھائی اماں تیرا ظلم سہنے کے واسطے جینے والی نہ تھیں گئیں اور ایسی جگہ گئیں۔ کہ اب نہ آئیں گی۔ دیکھ لینے کا ارمان دل میں تھا۔ وہ پورا نہ ہوا۔ یہ ڈھنڈار گھر۔ آدھی رات کا سنسان وقت۔ ماں کی موت اور میں اکیلی۔ دل کا اللہ ہی بیلی تھا جو خدمت ہو سکی۔ وہ کی۔ مگر ہائے سعید جو حق تھا وہ ادا نہ ہو سکا۔ کس دل سے لکھوں۔ اور کس مُنہ سے کہوں۔ اماں ہمیشہ کے واسطے چھوٹ گئیں۔ رات بھر مُردے کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہی۔ خدا ماموں جان کا بھلا کرے۔ کہ اُنہوں نے صبح کھڑے ہو کر اُن کو اصلی گھر میں پہنچا دیا +

---

[1] شادی کرنی ہے۔

رُویائے مقصود

تمہید

مان لیا کہ سید مقصود قیود مذہب سے قطعی آزاد اور احکام الٰہی سے بالکل غافل تھا۔ مگر اس کا جواب کیا ہوگا۔ کہ ایک ایسی ماں کے دودھ سے بڑھا اور گود میں پلا۔ جو عذاب الٰہی کے نام سے تھرا اٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گو لندن کے قیام نے اس کے اسلام پر پانی پھیر دیا۔ مگر پھر بھی جب انکار دنیوی سے فرصت اور ضروری کاروبار سے فراغت پاتا مسئلہ عبودیت پر غور کرنے بیٹھ جاتا۔ ورنہ معتزلہ کالج کا طالب علم۔ کیمبرج یونیورسٹی کا بی اے۔ سول سروس کا ممبر۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سو روپیہ کا معزز عہدہ دار مقصود سے اور خدا سے واسطہ کیا؟ ہم کو اس سے بحث نہیں کہ وہ ولایت کیوں گیا۔ ایل ایل ایم کی ڈگری چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر یہ شراب کا چنچلا کیسا پیچھے لگا لایا۔ گھر چھٹا بار چھٹا۔ مگر یہی مردار نہ چھٹی۔

ابتدائی تعلیم کو جانے دو صرف ماں کے خیالات کا اثر اب بھی اتنا کافی تھا۔ کہ اگر فرنس کے دلربا گرٹے نہ پڑتے تو وہ رنگ اکھڑنے والا نہ تھا۔ اور اگر مقصود زیادہ نہیں دو برس ماں کے پاس اور رہ

جائے۔ تو وہی پردے کی بیٹھنے والی۔ اور چار دیواری کی گھٹنے والی اُس کو انسان بنا دے۔ مگر افسوس ہے اُس کمبخت باپ پر جس نے نہ اِدھر کا رکھا نہ اُدھر کا۔ اُدھر میں لٹکا دیا۔ نو برس کی عمر سے جو جدا ہوا تو دو مہینہ لگ کر بھی ماں کے پاس رہنا نصیب نہ ہوا نہیں تو یہی مقصود جس کے واسطے آج تمام حیات آباد چھان مارا۔ اور ایک متنفس ایسا نہ ملا۔ جو اس کے دو سجدوں کی شہادت دیتا۔ اس ماں کے پاس سے ایسی طبیعت اور مزاج لے کر نکلتا۔ کہ فرانس کیا اگر کوہ قاف تک ہو آتا۔ تو خدا کی عظمت کو ہاتھ سے نہ دیتا ❊

خدا کو جان دینی ہے مقصود کے معاملہ میں ماں بالکل بیگناہ ہے ذمہ دار ہے تو باپ۔ کہ نہ آپ خدا کو سمجھا۔ نہ بیٹے کو سمجھنے دیا۔ نو برس کی جان کو جو اسکول میں لے جا کر چھوڑا۔ تو پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔ کہ یہ کر کیا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ اور ہونا چاہئے تھا۔ کہ ماں کے عقائد جو کچھ تھوڑے بہت ساتھ لے کر گیا تھا۔ ختم ہونا شروع ہوئے۔ باپ نے کی لاپروائی۔ ماں کے پاس رہنے کا موقع ملا نہیں مشفق شفیق۔ مصلح صلاح کار جو کچھ تھے۔ یا میاں نوکر سردار یا کالج کے در و دیوار صحبت ملی تو اُن کی جو نمازی کو کہیں گنہگار۔ ایماندار کو کہیں بیوقوف۔ دوست بنے تو وہ لڑکے جو انتہا کے خود غرض اور پرلے درجہ کے فیلسوف۔ اپنا رنگ یہ کچھ۔ ساتھیوں کے ڈھنگ وہ کچھ۔ اب مقصود کو مردود بنانے کے واسطے شیطان تو آنے سے رہا ❊

گو ان باتوں کو اب پچاس برس ہو گئے۔ مگر آج بھی اُس وقت کی دیکھنے والی صورتیں موجود ہیں۔ جب مقصود ولایت روانہ ہُوا ہے۔ دیندار ماں ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔ سلام کو جھکا تو کلیجہ سے لگا کر روئی۔ چُپکے چُپکے آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کی اور بآواز بلند کہا:۔

"مقصود خدا تیرا نگہبان۔ جان و ایمان کی سلامتی میں آنا نصیب ہو"

وہ اگر کامیابی امتحان کی متمنّی تھی۔ تو سلامتی ایمان کی دعا گو۔ درازی عمر کی خواستگار تھی۔ تو برکت اسلام کی طلبگار۔ مگر والد بزرگوار کی تمام تمنّاؤں اور دعاؤں کا دارومدار صرف ایک ڈگری پر تھا خاندان پر حرف آیا تو آیا۔ باپ کی عزت گئی تو گئی۔ مگر بیٹا ایل ایل ایم کہلایا +

کاش ناعاقبت اندیش باپ کے دل میں جہاں دنیوی ترقی کی اسقدر خواہشیں تھیں۔ ذرہ بھر روحانی ترقی کا بھی خیال ہوتا۔ ہمارا یقین تو یہ ہے۔ اگر مقصود مذہب کو سمجھ کر ولایت کو جاتا۔ تو اس کا یہ سفر سونے پر سہاگا ہوتا۔ اور وہی مقصود جو آج ایسا بدنام ہُوا۔ کہ ساری دُنیا تھڑی تھڑی کر رہی ہے۔ ایسا متقی پرہیزگار بن کر آتا۔ کہ تمام جہان واہ واہ کرتا +

بازار

مرزا۔ مسٹر مقصود کے خاندان کا قدیمی نوکر +

شریف۔ مرزا کا دوست +

(۱)

شریف۔ ہاں بھئی مرزا اب کیوں آنکھ ملانے لگے۔ اب تو جنٹ صاحب کے نوکر ہو۔

مرزا۔ ابے یار بس میٹھا بھی رہ۔ بڑے میر صاحب نے 'جد' کہا مرزا جی ہی کہا۔ اللہ بخشے منجھلے میاں کا۔ مرزا جی ہی کہتے کہتے مُنہ خشک ہوتا تھا۔ یہ ٹانگ "برتر" کا "لمڈا" بغیر ول کے بات ہی نہیں کرتا۔ قسم ہے اللہ کی جان اجیرن ہوگئی۔ بڑھاپے میں مٹی "پلیت" ہونی تھی ہو رہی ہے۔ (مُنہ پر ہاتھ پھیر کر) خدا اس سفید ڈاڑھی کی شرم رکھ لے۔

شریف۔ یہ منجھلے میاں کو سوجھی کیا۔ بیٹھے بٹھائے 'لمڈے' کو ولایت بھیج کرسٹان بنوا دیا۔ خدا کا وہ نہیں۔ رسول کا وہ نہیں۔ دین کا وہ نہیں۔ دُنیا کا وہ نہیں۔ رات دن شراب ہے۔ اور وہ ہے پی ہم نے بھی ہے۔ اور تم سے کیا چھپائیں۔ اب بھی عذر نہیں۔ مگر بھائی یہ تھوڑی کہ "ہر وخت" دھت بنے ہوئے ہیں۔

مرزا۔ شریف یار تو ہے بڑا ذلیل۔ ابے اپنی تو کہہ۔ تو نے عمر بھر میں کے دفعہ نماز پڑھی ہے۔ وہ تو اخیر کا بچہ ہے۔ اللہ نے اوپر سے "وِسکو" مت دی جو نہ کرے وہ تھوڑا۔

شریف۔ ایک تو ہوتا ہے اُلّو اور تو جو ہے تو اُلّو بھی نہیں اُلّو کا پٹھا ہے۔

مرزا جی یار بڑا نہ ماننا۔ ابے ہمارا کیا ہے۔ چوبیس سال جمعہ مسجد کے نیچے دبی بڑے بیچے۔ مگر کس مردود کو یہ بھی ہو کہ حوض کدھر ہے مگر بھائی ہم لاکھ نماز

نہ پڑھیں اللہ کو اللہ تو بجھتے ہیں۔ وہ تو سرے سے اللہ ہی سے پھرا ہوا ہے
پھر دیکھ لو کیا پھٹکار برس رہی ہے۔ خدا کی قسم بات کرتے ڈر لگتا ہے۔
رحیم بیچارہ لینے میں نہ دینے میں۔ پرسوں مارے جابخوں کے کھال اکھیڑ
دی +
مرزا۔ بنے اس کا تو کچھ دلات، جا کر رخ ہی بدل گیا۔ یہ وہی مقصود ہے
جس کے ہاتھوں ہم نے چاندی رولی ہے۔ اب تو بھائی اگر پوری تنخواہ بھی
پٹ جائے تو غنیمت ہے۔ دو دن بخار آگیا تھا۔ چٹ، سات آنے کاٹ
لئے۔ کوئی بھی تو خوش نہیں۔ کوچوان ہے وہ جھیک رہا ہے۔ سئیس ہے
وہ پیٹ رہا ہے۔ بھائی صمد چلے ہی گئے۔ ایک جسورہ گیا ہے صبح شام
وہ بھی چلا۔ مصیبت تو بھائی میری ہے۔ اب بتاؤ اس بڑھاپے میں کہاں
کہاں کی ٹھوکریں کھاتا پھروں۔ کئی دفعہ جی میں آئی کہ لعنت بھیجوں۔ مگر
پھر یہی سوچ کر چپ ہو گیا۔ کہاں مارا مارا پھروں گا۔ اور تھوڑی سی رہ گئی
ہے۔ اسے بھی گزار دوں۔ تم اپنی کہو آجکل کیا کر رہے ہو +
شریف۔ کیا خاک کر رہا ہوں۔ روٹی جڑتی ہے تو کپڑا نہیں۔ کپڑا ہوتا ہے
تو روٹی نہیں۔ عید سر پر آگئی۔ کوڑی پاس نہیں۔ گھر والی لے پندرہ پندرہ
دن سے ایک حشر مچا رکھا تھا۔ چاہے چوری کرو، چاہے ڈاکہ ڈالو، لما رے
کو جوتی پہنا کر لاؤ۔ کہاں صاحب سے جا کر دو روپیہ لایا۔ جوتی دکھا کر، اپنے
یہ ہی کھلے رہے۔ اور ان کو ڈیڑھ کی جوتی پہنائی۔ دوپہر کو جوتی پہنا کر لایا ہوں
چار گھڑی دن رہے جو آکر دیکھتا ہوں۔ کہ دروازے میں کلثرا رو رہا ہے۔

اب بہتیرا پوچھتا ہوں۔ ابے بھائی ہُوا کیا۔ مجال نہیں ٹُس سے مس ہو جائے روئے تو جاتا ہے۔ مگر بولتا نہیں۔ لڑکی نے آکر کہا آبا جو ایک جوتی جو بچے یں پھینک پایا۔ تو میاں اب وہ ایک پَیر رہ گیا ہے۔ چاہے اوڑھو چاہو بچھاؤ۔ نہ اُس پھینکنے والے کا کچھ گیا۔ نہ اُس منگوانے والی کا کچھ بگڑا۔ بچھ پر مفت میں ڈیڑھ کی ٹھک گئی۔ بڑے میر صاحب زندہ تھے تو اڑے تھڑے وقت بے وقت پیسہ دھیلے سے سلوک تو کر دیتے تھے۔ اب تمہارے جنٹ صاحب کے دروزّے پر تو سُنا ہے۔ فقیر تک کے جانے کا حکم نہیں ؛

(۲)

مسٹر مقصود کا بنگلہ

"ہاں ہاں میں کہہ چکی مجھے معاف کرو" ؛

مقصود۔ مجھ کو افسوس ہے کہ تم نہایت بدنصیب عورت ہو جس جگہ میں تم کو لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ شاید تم نے کیا تمہارے خاندان بھر نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ اگر تم کو ایسی سوسائٹی سے انکار ہے۔ تو میں متیقن ہوں کہ تم بدنصیب ہونے کے علاوہ بیوقوف بھی ہو۔ مس فلپ اور مسز جونز دونوں وہاں ہونگی۔ اگر تم کو ناچتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تو صرف ڈنر میں شریک ہو جانا۔ مجھ کو اُمید ہے کہ تم چھ بجکر بیس منٹ پر مکلب گھر چلنے کے واسطے تیار ہو گی ؛

بیوی۔ نوج! میں تیار رہوں۔ خدا مجھ کو اُس وقت زمین کا پیوند کر دے جب

میں وہاں چل کر کھانا کھاؤں۔ ناچیں گی وہی جن کے ہاں ہوتی آئی ہے۔
مجھ سے تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں ایسی عنایت سے باز آئی میرا دل
تم سے بات کرنے کو نہیں چاہتا +

مقصود (گھڑی دیکھ کر) چار بجنے میں دس منٹ ہیں۔ ٹھیک پانچ بجے
مجھ کو ٹنیس میں پہنچنا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ تم اس معاملہ میں مجھ سے
قطعی گفتگو کر لو۔ اور وہ بھی صرف اس وجہ سے۔ کہ میں مسز ہاربرٹ کو
لکھ چکا ہوں کہ مسز مقصود ضرور شریک ہوں گی +

کیوں تم کو ایسی لیڈیز کی صحبت میں شریک ہونے سے انکار
ہے۔ جن کا شمار اعلیٰ طبقہ میں کیا جا سکتا ہے؟

بیوی۔ ہاں ہاں میں کہہ چکی۔ مجھے معاف کرو! خدا معلوم تم کیوں مجھ
سے ایسی باتیں کیا کرتے ہو۔ مس فلپ جیسی اعلیٰ طبقہ کی ہیں مجھ کو خوب
معلوم ہے۔ ایسی عورتوں سے ملنا تم کو ہی مبارک ہو +

مقصود۔ کیا تم نے اُن کے چال چلن کی بابت کوئی لفظ خلاف تہذیب سُنا +

بیوی۔ تم میرا مُنہ نہ کھلواؤ۔ مجھ کو سب معلوم ہے۔ تم کو اختیار ہے تم اُن
کو جو چاہے سمجھو۔ میں تم کو تو منع نہیں کرتی +

مقصود۔ تم کو ایک کنواری ایک پاکدامن لڑکی کی نسبت ایسے الفاظ کہنے
میں سخت احتیاط کرنی چاہئے +

بیوی (ہنس کر) وہ کنواری سہی۔ پاکدامن سہی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ
سہی۔ پھر مجھے کیا؟

مقصود۔ بہرحال تم کو بہ حیثیت بیوی ہونے کے میرے حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی ٭

بیوی۔ اگر حکم قابلِ تعمیل ہو۔ تو سر آنکھوں سے! تم نے اُس دن میرا تین سو روپیہ کا چندن ہار اُن کو دے دیا۔ میں نے اُف تک نہ کی۔ خدا کی قسم اگر تم اپنے ہاتھ سے تمام زیور لُٹا دو۔ تو تم پر سے قربان کر دوں۔ مگر مرے ہوئے باپ دادا کی لاج۔ بزرگوں کی عزت۔ چاہے تم بگڑو۔ چاہے سنورو جب تک جان میں جان ہے ہاتھ سے نہ دوں گی ٭

مقصود۔ کیا تم قیدیوں کی طرح اپنی زندگی گزارنی پسند کرتی ہو۔ مہذب بننے کی کوشش کرو۔ اور ذرا اس احاطہ سے باہر نکل کر دیکھو۔ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے ٭

بیوی۔ تم جس کو قید کہتے ہو۔ میں اُس کو جوہر شرافت خیال کرتی ہوں۔ اور نعمت سمجھتی ہوں۔ اگر میں بدتہذیب ہوں۔ تو کیا تم مہذب عورت سے یہ اُمید رکھتے ہو۔ کہ وہ آدھی آدھی رات اور پچھلے پچھلے پہرے تمہارے واسطے کھانا گرم کرے گی۔ اور پکائے گی ٭

مقصود۔ اس کا میں احسان مند ہوں ٭

بیوی۔ میں تو اس کو ہمیشہ اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں اس کو احسان سمجھ کر کروں ٭

مقصود۔ اگر تم علم سے محروم نہ ہوتیں۔ تو ضرور بلا تامل تم میرے ساتھ چلتیں ٭

بیوی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جتنی تمہاری مس فلپ انگریزی جانتی ہیں۔
اُتنی میں اُردو جانتی ہوں جس قدر وہ اپنے مذہب سے واقف ہونگی۔
میں اُن سے زیادہ اپنے مذہب سے واقف ہوں۔ البتہ ایک فرق ہے۔
اُن کی نگاہ سے صبح سے شام تک سیکڑوں مرد گزرتے ہیں۔ مجھ کو یہ اتفاق
کبھی نہیں ہوتا +

مقصود۔ سب سے بڑا فرق تو تم تہذیب و خلق کا دیکھ سکتی ہو جس کا تم
میں پتہ نہیں +

بیوی۔ سبحان اللہ اخلق و تہذیب کا نمونہ تو ایک تم ہی بیٹھے ہو۔ چاہے
کوئی مرتے مرجائے۔ مگر تمہاری بلا سے۔ میری بڑھیا کی نہاسی کو پرسوں
بخار ہو گیا تھا۔ دن بھر میں نے اپنے ہاتھ سے دوا پلائی ہے۔ اب میں
جاتی ہوں میری عصر کی نماز قضا ہو رہی ہے +

(۳)

حیات آباد شہر تو کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ مگر چھاؤنی کی وجہ سے عجیب
رونق پر تھا۔ مقصود کو چھٹی پر آئے تیسرا مہینہ ہوگا کہ نومبر کے رسالے
میں کالے بگڑے۔ جب تک گوروں کی فوج سرکوبی کو آئے۔ کالوں نے
تو حیات آباد کو سر پر اُٹھا لیا۔ دوپہر تک تو شان گمان بھی نہ تھا۔ بارہ بجے
کی توپ خاصی اچھی طرح چھوٹی۔ تین بجتے بجتے تو گلی کوچوں میں خون کی تلیاں
بہہ رہی تھیں۔ کیسا مصیبت ناک وقت تھا۔ بکروں کی طرح آدمی ذبح ہو رہے
تھے۔ بڑے بڑے مالدار چار چار پیسوں کے واسطے موت کا شکار ہو گئے۔

کہیں دو بجے رات کے گوروں کی فوج پہنچی۔ تو وہ زور کم ہوا۔ فتنہ فرو ہو چکا۔ تو تحقیقات شروع ہوئی کہ باغیوں میں کون کون شریک تھا +

حیات آباد کی سرحد سے ملا ہوا موضع حسن پور بیس بسوے کا گاؤں تھا۔ جس پر دونوں بہن بھائی مقصود کے ماموں اور ماں نصف و چوتھائی کے حصّہ دار تھے۔ ماں کے دم تک تو مقصود خون کے گھونٹ پی پی کر چپکا بیٹھا رہا۔ مگر ماں کے مرتے ہی ظالم اس فکر میں پڑ گیا۔ کہ کسی طرح حسن پور سالم میرے قبضہ میں آ جائے۔ سیکڑوں تجویزیں ہزاروں کوششیں۔ لاکھوں جتن سب کچھ ہی کر ڈالا۔ مگر ایک تھیلی کے چٹے بٹے ماموں مُمانی بھی ایسے بچے نہ تھے۔ کہ اُس کے پھندے میں پھنس جاتے۔ لیکن اب مقصود چوکنے والے بنارے نہ تھے۔ سفاک بیرحم ایک عرصہ سے تاک میں تھا۔ غدر کو نعمت۔ اور تحقیقات کو غنیمت سمجھ کر سازش کا تمام الزام ماموں کے سر تھوپ غریب کو حبس دوام بعبور دریائے شور اور مُمانی کو عمر بھر کے واسطے زندہ درگور کر دیا +

وہ نہایت درد انگیز وقت تھا جب آخر پیشی کے روز مُمانی اپنے آٹھ برس کے بچے محمود کا ہاتھ پکڑے ہوئے مقصود کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی :-

"بیٹا مقصود ہم پر رحم کر۔ میں نے تجھ کو دودھ پلایا ہے۔ لِللہ ترس کھا۔ سارا گاؤں لے۔ دونوں مکان لے۔ مگر اتنی زیادتی نہ کر" +

مقصود۔ یہ الفاظ آپ کی زبان سے بہت دیر میں نکلے۔ اب ان کا وقت نہیں رہا۔ کیونکہ اب میں کچھ کرنا پسند نہ کروں گا۔ البتہ اتنا کہ سکتا ہوں کہ اپنی

اٹھارہ سو گی ڈگری کا اجرا چار روز کیواسطے ملتوی کر دوں۔ ماموں جان غالباً کل شام کو کالے پانی بھیج دیئے جائیں۔ اس کے بعد تین روز نہایت کافی وقت ہے۔ چاہئے کہ مقصود حقیقی ماموں کو برباد اور ممانی کو تاراج کرکے چین سے بیٹھ جاتا، ناممکن۔ اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اصول صرف ضرر رسانی قرار دیا تھا خواہ ماموں ہوں یا ممانی، میاں کے جلاوطن ہونے پر بیوی اور بچہ دونوں اس کی جان کو دعائیں دے رہے تھے۔ اتفاق سے ایک روز دوپہر کے وقت بچہ ایک تصویر ہاتھ میں لئے ہوئے ماں کے پاس آبیٹھا۔ یہ ایک حسرت نصیب عورت کی تصویر تھی۔ جو سمندر کے کنارے کھڑی تھی۔ اور اس کا خاوند سفر کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ پانی کی موجوں کو غور سے دیکھتی رہی لیکن جس وقت جہاز روانہ ہوا۔ اور میاں بیوی کی چار آنکھیں ہوئیں۔ فرط محبت سے بے چین ہو کر کہنے لگی:۔

"آہ یہ سفر ہمیشہ کے لئے نہ ہو"۔

مصیبت زدہ بیوی نے محمود کے ہاتھوں سے لیکر اس تصویر کو دیکھا اپنے بیگناہ خاوند کی مسکینی اور غربت کا خیال آتا تھا۔ کہ طبیعت کی بےچینی اور زیادہ ہوئی۔ سوچنے لگی۔ اے اللہ مجھ سے بڑھکر بدنصیب اور کون ہوگا۔ جس کے ساتھ عمر بسر کرنی تھی۔ وہ کالے کوسوں پہنچ گیا۔ اور میں ابتک زندہ ہوں۔ بچے کی بہار کے دن آئے۔ تو چین ہی اجاڑ ہوگیا۔ یہ پہاڑ سی زندگی کیونکر کاٹوں؟ میں مظلوم۔ یہ معصوم۔ کروں تو کیا۔ ہائے میرے اللہ میں تو قصور بھی معاف نہ کرا سکی۔ کلیجہ کے ٹکڑے پہلے ہی اُڑ رہے تھے۔ معافی قصور کا خیال

آتا تھا۔ بالکل ہی بے اختیار ہو گئی۔ اور بے اوسانی میں چلّا اُٹھی:۔

"میں لونڈی ہوں میرا قصور معاف کر دینا"۔

ماں کی آہ زستنتے ہی بچہ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اور گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا:۔ "اماں بی کس کی لونڈی ہو؟"

بچّہ کا کلیجے سے لگنا تھا۔ اور زیادہ جی بھر آیا۔ خوب روئی۔ ماں کو روتا دیکھ کر بچّہ بھی رونے لگا۔ رو چکی تو دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھے بچّے کو پیار کیا اور کہا:۔

"میرے چاند میں صدقے تو کیوں روتا ہے"۔

ماں بیٹے ابھی رو ہی رہے تھے جو کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ ماما کو بھیج کر دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا میاں مقصود کچہری کے دو آدمیوں کو لے کر آئے ہیں۔ یا اٹھارہ سو روپیہ دو نہیں تو پردہ کر لو۔

بدنصیب بی بی کچھ دیر تک تو سوچتی رہی۔ اور پھر یہ کہتی ہوئی صحنچی میں چلی گئی "کس کا روپیہ اور کیا روپیہ"۔

دو چپڑاسی۔ ایک قرق امین۔ اور مسٹر مقصود اندر داخل ہو گئے۔ امیر کا گھر برسوں کا بنا ہوا۔ گھر کی ایک ایک چیز مُنہ سے بول رہی تھی۔ آناً فاناً تمام چیزیں سمیٹ سماٹ باہر کھنچنی شروع کیں۔ کلیجہ کٹ جانیوالا وقت وہ تھا۔ جب مقصود کے اشارے سے قرق امین نے ولایتی پنجرا اُٹھایا جس میں بچّے کا طوطا تھا۔ پنجرا اُٹھاتے ہی بچّہ بلک گیا اور ہاتھ جوڑ کر مقصود سے کہنے لگا:۔

"اچھے بھائی جان میرا مٹھو نہ لو"۔

وہ کیا دردناک وقت تھا جب محمود ہاتھ جوڑے مقصود کے قدموں میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ اور گردن اونچی کئے اس اُمید پر اُس کا منہ تک رہا تھا۔ کہ شاید پنجرا رکھوا لے۔ جب سنگ دل مقصود نے جھڑک دیا۔ تو روتا ہوا ماں کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا:۔

"اے بی اماں میرا مٹھو بھی لے گئے"۔

(۴)

مقصود۔ لیکن مسٹر فلپ ڈیوارز سپیشل وسکی اور ایسی تیز! میرے تجربہ میں گرین سیل سب سے بہتر چیز ثابت ہوئی ہے۔

فلپ۔ مسٹر کوک نے سفارش کی تھی (کچھ دیر سکوت کے بعد) ویل مسٹر مقصود! آپ نے اپنی بیوی کی بابت کیا فیصلہ کیا۔

مقصود۔ وہ کچھ قدرتی طور پر نہایت خدا ترس عورت واقع ہوئی ہے۔ اور چونکہ ایک سخت مذہبی باپ کی بیٹی ہے۔ اس لئے ہر وقت اور ہر معاملے میں اپنے خدا کو ضرور شامل رکھتی ہے۔ مگر سچ یہ ہے میں نے توحید و تثلیث دونوں پر بارہا غور کیا۔ میری سمجھ میں یہ سب ڈھکوسلا ہے (قہقہہ) سنتا ہوں۔ اُس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ مگر میں تو شب و روز ایسے واقعات دیکھتا ہوں جن میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ قحط سے سیکڑوں جانیں بلا ضرورت ضائع ہوتی ہیں۔ وبا سے ہزاروں آدمی بے خطا مر جاتے ہیں۔ کیا یہ فعل اُس شخص کے ہو سکتے ہیں۔ جو رحم دل سمجھا جائے (پی کر)

عورت کے معاملہ میں۔ تو مسلمانوں نے واقعی ہٹ دھرمی کر رکھی ہے۔ تعلقات باہمی میں اُس کے حقوق بالکل نظرانداز کر دیئے ÷

فلپ۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ بیوی کی طرف سے آپ بہت پریشان ہیں۔ آپ اس باقی گلاس کو ختم کیجئے ÷

مقصود۔ (پی چکنے کے بعد) میں اب جانا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت خراب ہوگئی ÷

مقصود کو شراب پینے کا آج پہلا اتفاق تو تھا ہی نہیں۔ ماشاءاللہ عمر اسی میں گزری تھی۔ مگر خدا معلوم فلپ نے کیا ستم کیا۔ کہ ایک ہی پیگ میں حواس باختہ ہوگیا۔ چکر آئے۔ جی متلایا۔ قے ہوئی۔ نشہ تھا۔ کہ اَور زیادہ ہُوا۔ جانے لگا تو برآمدہ میں سپوٹ (بلڈ انگ) راتب کھا رہا تھا۔ ویل ویل کہتا ہُوا جو اُس پر جھکا۔ تو دھڑام سے اوپر گر پڑا۔ اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ کتا بُلڈ انگ تھا۔ مگر یہ خدا ہی جانے کہ بلڈ وگمیٹ کی وجہ سے یا یہ سمجھ کر۔ کہ مقصود میرے راتب میں حصّہ بٹائے گا۔ سپوٹ بگڑ گیا۔ وہ تو یہ خیر ہوئی۔ کہ مسٹر فلپ ساتھ تھے۔ کتے کو سمجھا بجھا کر الگ کیا۔ اور مقصود کو اُٹھا اُٹھو کر گاڑی میں لائے۔ ورنہ شراب کا پورا مزہ آجاتا ÷

اتفاق یہ کہ ہولی کا تھا دن۔ اور مقصود کا کوچوان پورب کا منہی۔ وہ بھی نشہ میں چور تھا۔ مسٹر فلپ سے کیا کہتا ہے:۔

بس تم بابو جی جات ہے ÷

فلپ۔ یو سئور ہم بابو ہے ÷

کوچوان۔ اجی نہیں۔ ہم تو اپنا بابو سے پوچھت ہے +

فلپ۔ وہ بھی بابو نہیں ہے +

کوچوان۔ اجی..... ہمکا تو سب بابو ہیں..... یا گھوڑوا بابو ہے...... لال..... ٹینٹوا بابو ہے۔ یا کوٹھیو بابو ہے!

فلپ (ہنس کر) اچھا جاؤ۔ مگر بہت ہوشیاری سے جاؤ +

اِدھر آقا اُدھر کوچوان دونوں بیہوش۔ اب گاڑی گھوڑے کا اللہ ہی نگہبان تھا۔ بندر کی بلا طویلہ کے سر۔ منشی کو جو نشہ میں کچھ ترنگ سوجھی تو ہنٹر لے کر گھوڑے کو سوت دیا۔ گھوڑا غریب سٹ پٹا گیا۔ کہ یہ آفت کیا آئی چل رہا ہوں۔ بھاگ رہا ہوں اور ہنٹر پر ہنٹر پڑ رہا ہے۔ جانور تھا تو بلا سے جان تو رکھتا ہی تھا کب تک پٹتا گاڑی سمیت نالی میں جا پڑا خیریت یہ ہوئی کہ مقصود الگ جا کر پڑا۔ مگر چوان کی بائیں ٹانگ تو بم کے نیچے ایسی دبی کہ بہتیرا تڑپا۔ مگر ٹانگ نہ نکلنی تھی اور نہ نکلی۔ لیکن کیا پابند وضع آدمی تھا۔ اُسی طرح ہنٹر پٹخارتا رہا۔ اور یہ ہی کہتا رہا۔ واہ بے گھوڑے واہ +

ظاہری وقعت کے اعتبار سے میاں مقصود کے خوشامدی کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر دلی خیر خواہ تو بستی بھر میں ایک اللہ کا بندہ بھی مشکل سے ہوگا۔ اگر کہیں مقصود گاڑی کے نیچے دب جائے۔ تو انشاء اللہ تڑپ ہی تڑپ کر مرے۔ اور دیکھنے والے مُنہ پھیر کر چل دیں۔ تقدیر کا زبردست تھا۔ گرا بھی تو بال بال بچا۔ گاڑی تو ضرور چور چور ہوگئی۔ لیکن وہ خود اپنے کپڑے جھاڑ جھوڑ اُٹھ کھڑا ہوا گھر آیا تو محلہ کی مسجد میں وعظ ہو رہا تھا۔ اور مولوی صاحب

جھوم جھوم کر فرما رہے تھے:۔

"آج وہ رات ہے کہ آسمان اوّل پر باری تعالیٰ نزول فرما کر کہتا ہے ارو کرم "ہے کوئی جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں دوں +

مقصود کو اس فقرے پر بے اختیار ہنسی آئی۔ قہقہہ لگاتا ہوا گھر آیا۔ پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ کہ دنیا بھر کے بھید کھلے۔ مگر نہ کھلا تو خدا کا۔ اسی خیال میں تھا کہ نیند آگئی۔ اب ایک اور ہی سماں آنکھ کے سامنے تھا+

(۵)

خواب

ایک جنگل بیابان ہے۔ جہاں کوسوں انسان کا پتہ نہیں۔ برسات کا موسم ~~بھیانک~~۔ دھواں دھار گھٹا۔ جھین مہین پھوار کالے کالے بادل۔ اودی اودی بدلی۔ ہر چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ لیکن ایک ہُو کا میدان تھا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ جہانتک۔ نظر جاتی تھی اور جس طرف دیکھتا تھا جنگل ہی جنگل تھا۔ دفعتہً ایک ایسی ہیبت ناک آواز کان میں آئی۔ کہ کلیجہ چار چار ہاتھ اچھلنے لگا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بھاگا دوڑا۔ چلتے چلتے پاؤں تھم گئے۔ گھورتے گھورتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ مگر کسی طرح چھٹکارا نہ ہوا۔ سوچ رہا تھا۔ کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس کو بلاؤں۔ ایک طرف سے اذان کی آواز آئی۔ اُسی طرف چلا۔ پاس جا کر دیکھا۔ تو کیکر کے درخت میں سے آواز نکل رہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی جان نکل گئی۔ ڈر کر بھاگا۔ تو ایک اژدہے نے اس زور سے پھنکا

ماری کہ جنگل بھر گونج اُٹھا۔ آگے بڑھا۔ تو برابر سے چپڑ چپڑ کی آواز آئی۔ غور سے دیکھا۔ تو ایک چیتے کی سی صورت تھی۔ جو کسی کو دبوچے تھا۔ رنگ فق ہو گیا۔ چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اب مقصود کو یقین ہو گیا۔ کہ جان بچنی مشکل ہے۔ جدھر جاتا تھا راہ نجات مسدود تھی۔ خدا خدا کرکے ایک چار دیواری دکھائی دی۔ سنگ مرمر کا عالی شان دروازہ تھا۔ شکر کرتا ہوا اُدھر چلا اندر لپک کے اندر گھس گیا۔ دیکھتا ہے تو ایک خوبصورت بارہ دری ہے بنا بٹی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ نواڑی پلنگ بچھے ہوئے۔ اُجلی اُجلی چادریں کسی ہوئیں میزیں۔ کرسیاں۔ غالیچے۔ قالین۔ فرش فروش ایک سے ایک بیش قیمت۔ کورے کورے مٹکے۔ سوندھی سوندھی صراحیاں قلعی دار کٹورے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر نہ انسان نہ حیوان! مقصود کی تو یہ سامان دیکھ کر جان میں جان آگئی جھٹ ایک آرام کرسی پر جا لیٹا۔ دو چار لمحہ سکون کے گزرے ہوں گے۔ کہ ایک پیر مرد سپید داڑھی سر پر عمامہ۔ ہاتھ میں تسبیح اندر تشریف لائے۔ مقصود تعظیم کو اُٹھا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ابھی سلام ختم نہ ہوا تھا۔ کہ پیر مرد نے ایک تھپیڑ منہ پر اس زور سے دیا۔ کہ چہرہ پھر گیا۔

مقصود۔ بیشک میں بلا اجازت اندر آگیا۔ مگر جس وقت جناب میرے واقعات سنیں گے۔ مجھ کو پورا یقین ہے۔ ہمدردی فرمائیں گے۔

پیر مرد نے یہ سُن کر ایک تھپیڑ دوسری طرف بھی دیا۔

مقصود۔ مگر مجھ کو اجازت دیجئے۔ کہ اپنی حالت کا اظہار جناب پر کردوں۔

اتنا ہی سُنتے ہی پیر مرد اُچک کر مقصود کی پیٹھ پر سوار ہو گئے +

مقصود - جناب کا اسم گرامی ؟

پیر مرد - فرشتہ کہتے ہیں +

مقصود - مجھ کو جناب کے شیطان یقین کرنے میں بھی شبہ ہے +

اتنا کہنا تھا کہ پیر مرد نے پیٹھ پر سے اُتر مقصود کے دونوں کان پکڑے اور چک پھیری پھرانی شروع کی +

مقصود - حضور آپ فرشتہ نہیں - خدا بھی - مگر میرے کان ٹوٹے غریب پرور میری جان نکلی +

پیر مرد نے مقصود کو چھوڑا - مگر چھوڑتے ہی اس زور سے کلے میں کا ٹا کہ پلکتا پڑ گیا +

مقصود - او بد تمیز بد تہذیب یہ کیا کرتا ہے +

اب پیر مرد نے فٹ بال کی طرح مقصود پر لگیں اُڑانی شروع کیں کبھی اِدھر اُچھالا کبھی اُدھر اُچھالا +

مقصود - آپ پہلے شخص ہیں - کہ تمام عمر میں ایسے بد تہذیب آدمی سے مجھ کو سابقہ پڑا +

پیر مرد - مگر اے ملعون تو مجھ سے بہت زیادہ بد تہذیب ہے +

مجبور مسٹر مقصود - دروازے کی طرف یہ کہہ کر چلے میں پولیس کو بلاتا ہوں +

پیر مرد - (گردن پکڑ کے) ادھر آ او میری جان چلے کہاں ؟

مقصود۔ او نالایق کوئی وجہ نہیں کہ میں تیری زحمتیں بھگتوں +

پیرمرد۔ اچھا آپ مہربانی فرماکر ذرا جھک کر گھوڑا بن جائیے۔ ابیاں تو تہذیب سے کہہ رہا ہوں +

مقصود۔ مجھ کو اسقدر تکلیف دے کر آپ کو کیا مزہ آرہا ہے +

پیرمرد۔ (دھکا دیکر پیٹھ پر سوار ہونے کے بعد) میاں تو ہمارا مہمان ہے +

مقصود۔ بدمعاش کمبخت +

پیرمرد۔ اچھا اب تو ایکس چکر اس کمرے کے کاٹ۔ مگر شرط یہ ہے کہ سانس نہ ٹوٹے +

مقصود۔ میری رائے میں تو ہرگز انسان نہیں ہے۔ بے ایمان +

پیرمرد۔ (مقصود کی ناک زور سے بھینچ کر) اچھا تو جانور سہی +

مقصود۔ او ملعون میری ناک چھوڑ۔ ابے چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ۔ اجی حضرت چھوڑ دیئے۔ قبلہ للہ چھوڑ دیجئے +

پیرمرد۔ ابھی سے +

مقصود۔ مجھ کو چھینک آرہی ہے۔ ممکن ہے کہ جناب کا ہاتھ خراب ہوجائے

پیرمرد۔ میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ جناب کی ناک ٹوٹ جائے (ایک ہنٹر لگا کر) آہا ہا بھئی قسم ہے خدا کی۔ کیا آواز ہوتی ہے مزہ آگیا +

مقصود (بلبلا کر) اجی بندہ نواز۔ ابے اُلّو کے پٹھے۔ اُتر بے ایمان۔ تو ہے کون +

پیرمرد۔ (مقصود کی گردن اپنی ٹانگوں میں بھینچ کر) اچھا تم پہلے زور کر لو

پھر دیکھی جائے گی +

مقصود۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں آ پھنسا +

پیر مرد۔ الحمد للہ کا شکر ہے۔ کیا وضعدار مہمان دیا ہے۔ کولر بھی ٹائی بھی +

مقصود۔ بیرا۔ چپراسی۔ مرزا حسنو۔ اجی بڑے صاحب گردن چھوڑ دو۔ خدارا یہ تو فرمائیے آپ ہیں کون صاحب ؟

پیر مرد۔ (الگ ہٹ کر)

میں تیرے اُس ماموں کی رُوح ہوں جس نے آج علی الصباح جزائر انڈمن میں اپنے فانی جسم کو الوداع کہا۔ تو نے جیسا سنگدلی کا برتاؤ میرے اور میرے بیوی بچے کے ساتھ کیا۔ اس کو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اے شقی ازلی، تو نے محض اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے ایک ایسے میاں بیوی کو برباد کر دیا جو نہایت اطمینان سے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ دنیا کی تمام راحتیں اُن کو میسر تھیں۔ اور محبت جو سب سے بڑی نعمت ہے۔ اُن کے ساتھ تھی۔ اے بے رحم۔ وہ دو انسان جن کی تمام خوشیاں جن کے تمام ارمان ایک دوسرے سے متعلق تھے۔ تو نے قبل از وقت اُنکا خاتمہ کر دیا۔ وہ مرد عورت جو تمام عمر کے واسطے ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک تھے تیرے ہاتھوں اور صرف تیرے ہاتھوں، ایسے جدا ہوئے کہ پھر نہ مل سکے۔ آہ جو عمر بھر کے لئے تابعدار ہو چکی تھی جس کی زندگی کا مقصد صرف فرمانبرداری تھا۔ اے مقصود تیری بدولت اپنا کوئی حق ادا نہ کر سکی اے جفاکار آنکھ سامنے کر۔ جس کی شرمگیں نگاہوں نے گھونگٹ

ہیں وفاداری کا اقرار کیا تھا۔ تیری وجہ سے ہاں ہاں تیری وجہ سے مر مر کے
پر بھی نہ آسکی۔ وہ بھولی صورت قابلِ رحم مخلوق جو اپنے جیتے جاگتے عزیز و
اقارب چھوڑ چھاڑ ایک غیر شخص کے پلّے آکر پڑی جس نے اپنی عزت۔ اپنی
عصمت۔ اپنی زندگی غرض ہر چیز کا دارو مدار ایک اجنبی دم پر منحصر کر دیا۔
افسوس۔ افسوس مقصود اُس کی آنکھیں ترستی رہیں اور کامیاب نہ ہوئیں۔
اے بیرحم ایک وارث والی کو بے وارث کر دیا +

اسی دنیائے ناپائدار میں بہت سی متبرک صورتیں اور ہزار دل اللہ
کے بندے ایسے بھی دکھائی دینگے۔ جو رانڈوں۔ دکھیاریوں مصیبت کی
ماریوں پر اپنا عیش و آرام قربان کر دیتے ہیں۔ خود زیر بار ہوتے ہیں تکلیف
اٹھاتے ہیں۔ اور اُن کی دلجوئی کرتے ہیں + تو اُس دادا کا پوتا ہے جو ظہر کی نماز
پڑھ کر محلہ بھر کی رانڈوں اور بے وارثوں کا گوشت ترکاری پوٹ کی پوٹ
کندھے پر رکھ کر لاتے تھے۔ مگر اے انسان کی صورت میں حیوان۔ اے
مقصود بے وفا مقصود بے ایمان مقصود حقیقی ممانی۔ ماں سے زیادہ چاہنے
والی ممانی۔ دودھ پلانے والی ممانی۔ اپنے بچے کا پیٹ کاٹ کر اُس وقت
تیرا پیٹ بھرنے والی ممانی جب تو کسی قابل نہ تھا تیرے ہاتھ سے شوہردار
بیوہ ہو گئی +

مقصود اُمّو شمع حسن نور نہ سدا میرے پاس رہا نہ تیرے پاس رہے گا۔
مگر یہ بدنما دھبہ۔ یہ سیاہ داغ۔ یہ کلنک کا ٹیکا چودھویں رات کے چاند کی
طرح تیرے نام پر روشن رہیگا +

انڈمن پہنچتے ہی جب میرے سامنے برابر کی مٹی ملی ہوئی خو کی روٹی آئی۔ لقمہ حلق سے نہ اتر سکی۔ میں نے رو کر کہا۔ اے خالق الموجودات ان آفات سے اب نجات دے! اکیس روز کی مصیبتیں بھگت لینے کے بعد یہ دعا مقبول ہوئی۔ مگر ہائے ستم شعار! محمود آہ محمود میرا چھوٹا سا محمود۔ وہ محمود جو کبھی دم بھر آنکھ سے اوجھل نہ ہوا تھا ہمیشہ کو جدا ہو گیا۔ اے مقصود دم واپسیں سینہ میں تھا۔ اور آنکھیں اُس پیارے بچہ کو چاروں طرف ڈھونڈ رہی تھیں ؎

اے ظالم تو نے اُس عورت کی آہ لی ہے۔ جو بیگم بن کر آئی اور لونڈی بن کر رہی۔ چوبیس برس کا ساتھ اے فتنہ پرداز فقط تیری وجہ سے چھوٹا ؎ یتیموں کی ناز برداری شیوۂ انسانیت ہے۔ مگر تو نے اپنی زندگی میں ایک ایسا کارنمایاں کیا جو صفحۂ ہستی پر ہمیشہ یادگار رہے گا +

وہ جسد خاکی جس نے کئی گھنٹے تڑپ تڑپ کر مجھ سے مفارقت کی۔ جزائر انڈمن میں جیل خانہ کی پشت پر گھسکوار کے پاس ایک گڑھے میں دبا دیا گیا +

جا اپنا کام کر۔ مگر اتنا یاد رکھیو۔ آج ایک بیگناہ کے جلاوطن کرنے میں مسٹر نکر کے اجلاس سے تجھ کو کامیابی ہوئی۔ مگر کل ایک وقت ایسا آئیگا اور ضرور آئیگا کہ تیرا بڈھا ماموں تیری مظلوم ممانی اور ایک آٹھ برس کا معصوم بچہ ایک سچے دربار میں۔ ایک اچھے دربار میں تیرے ظلم کی فریاد کرکے عادلِ حقیقی سے انصاف کے طلبگار ہونگے۔ مقصود! وہ نہایت نازک وقت ہوگا۔ اور عدالت ایسی عدالت ہوگی۔ جس کا فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا ؎

جھولے کی یاد

گرمی اس غضب کی پڑ رہی تھی۔ کہ آدھی رات تک دو منزلوں اور سہ منزلوں پر پنکھا ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ اور زمین سے شعلے نکل رہے تھے۔ خدا خدا کر کے کہیں پچھلے پہر ذرا ہوا سرسرائی تو آنکھ لگی۔ مگر کیا خاک لگی؟ ادھر جھپکی۔ ادھر مرغ کی ککڑوں کوں شروع ہوئی۔ پَو پھٹتے ہی کمبخت مکھیوں کی یورش ہونے لگی۔ غرض ساری رات اسی میں گزر گئی بہتیرے ہی جتن کئے۔ کہ گھنٹے آدھ ہی گھنٹے کو سو رہوں لیکن کروٹیں ہی بدلتے بدلتے خاصی اچھی صبح ہو گئی۔ اور تو کما ایسا جھونکا آیا۔ جس نے سر سے پاؤں تک جھلسا دیا ؛

ساون کا مہینہ تھا۔ کوئل اور موتیا چمک اور مہک رہی تھی۔ مگر گرمی نے کچھ ایسی دم پر بنا رکھی تھی۔ کہ جان ست ہی رت پڑتی۔ ٹھنڈے پانی کے کئی ایک تتھڑے غسل خانے میں سر پر ڈال باہر نکلی۔ تو کیا دیکھتی ہوں پورب کی طرف سے سیاہ گھٹا اُٹھ رہی ہے۔ آناً فاناً سارا آسمان کالا بھنور ہو گیا۔ اور ٹھنڈے ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ دل باغ باغ ہو۔ ابھی کچھ ایسا گھر کر آیا کہ میں بے ساختہ بول اُٹھی۔ کہ برس گیا تو اچھا جوں ہی ہے ؛ مینہ برسنا شروع ہوا۔ اور ایسا دھائیں دھائیں۔ کہ شام تک کھلنے

کا نام نہ تھا۔ میں سائبان میں جھکی پڑی تھی۔ لڑکیاں بالیاں بچا نے دبندھنے میں لگی تھیں۔ بستی بھیگتی بھاگتی آ پہنچیں۔ اور کہنے لگیں دو شمسہ بڑھاپے میں جوانی یاد آرہی ہے۔ برابر کی سہیلیاں جھیلیاں اکیلا چھوڑ سیدھی ہولیں۔ جی بہت گھبرایا۔ تو تیرے پاس نکل آئی۔ کہ چلوں کچھ شمسہ ہی سے مغز ماروں"۔

بستی اور میں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ ہمارا لڑکپن غدر سے پانچ سات سال بعد کا ہے۔ اب وہ اور میں نانی دادی بن گئے۔ بلکہ وہ تو پڑنانی بن گئی۔ کہ نواسی کے ہاں بھی لڑکی ہو گئی۔ بستی کی صورت دیکھ کر کیا بتاؤں کیسی خوشی ہوئی۔ دل کا کنول ہرا ہو گیا۔ کوئی چھ برس بعد دیکھا تھا۔ آواز سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ وہ بھی دوڑ کر لپٹ گئی۔ بہو بیٹیاں ٹھٹھے اڑا رہی تھیں۔ کہ دیکھو بڑھیوں کا کیا سہاگ ہو رہا ہے۔ مگر ہم نے پروا نکی مینہ تھم چکا تھا۔ اور پوروا فراٹے اڑا رہی تھی۔ ہم دونوں کوٹھے پر چلے گئے۔ تو بستی کہنے لگی:۔

"اندھیر ہے۔ رت بدلی۔ موسم بدلا۔ آدمی بدلے۔ مرد بدلے۔ عورتیں بدلیں۔ کچھ ایسی کایا پلٹی۔ کہ وہ رنگ ہی نہ رہا۔ ہم نے اس برسات سے کیسے کیسے مزے لوٹے ہیں۔ کہ آج ان کی یاد سے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ اب وہ سماں سننے میں بھی نہیں آتا۔ یہ ساون کی راتیں۔ محلہ ملاروں سے گونج جاتا تھا۔ کون سا ایسا گھر ہوگا۔ جہاں کھم نہ گڑے ہوں۔ اور جھولا نہ پڑا ہو۔ شمسہ امرتیوں کے جمگھٹ یاد ہیں؟ آم کے درختوں میں لال سبز رسیاں پڑی ہیں۔ گنگا جمنی پٹڑیاں ڈلی ہیں۔ اور کڑھائیاں چڑھ رہی ہیں۔

روے میدے کے گرم گرم پراٹھے تنور سے آ رہے ہیں۔ اندھیری باغ کا ٹپکا۔ قند سے میٹھا۔ جہاں گیر کے باغ کی موٹی موٹی جامنیں۔ کالی بھونرالی دو جھول رہی ہیں۔ چار جھلا رہی ہیں۔ وہ چہل پہل ہو رہی ہے۔ کہ جنگل میں منگل ہو گیا۔

"چھوٹی چچی جان کے جھولے میں تو بادشاہ بیگم بھی آئی تھیں"۔ دو تین دن پہلے تیاریاں ہو گئی تھیں۔ چچی جان بارہ تیرہ برس کی دلہن تھیں ایک دن اور رات کیا دھما چوکڑی مچائی ہے کہ مالی تک چیخ اُٹھے بیگم صاحبہ نماز پڑھتے ہی آ گئی تھیں۔ کھانے پینے کی اُن کے ساتھ کمی تھی مگر کیسی جنتی بیوی تھیں۔ کہ ہمارا دل نہ توڑا اور اپنا کھانا چھوڑ چھاڑ ہمارے بسنی پراٹھوں میں آ بیٹھیں۔ اے ہے شمسہ وہ دن تو اب جیسے گئے۔ وہ پراٹھے دیکھنے ہی میں نہیں آتے۔ رجب کے ہاتھ کا تو سوندن ہی نہیں سکتا۔ آم کا اچار سرکے کی میٹھی چٹنی اب بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ مزا نہیں پھوپی آمنہ نے کیا پھرتی کی ہے۔ کہ سب دنگ رہ گئے۔ ہم سب تو بیگم صاحبہ کے دیکھنے ہی میں رہے۔ اُنہوں نے جھٹ چولھا رکھ آگ سلگا کر کڑھائی چڑھائی گرم گرم شامی کباب اُتار تر پھر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دیئے۔

"ناشتہ کر پھسلنے پتھر پر آئے۔ پہلے بادشاہ بیگم پھسلیں۔ اُن کے بعد ہم سب پھسل پھسا جھرنے پہ پہنچے۔ زنانہ ٹکڑے میں کمر کمر پانی تھا۔ کیا کیا دھما دھم گدائی ہوئی ہے کہ پانی بھی چیخ اُٹھا۔ نہا دھو کپڑے بدلے تو آموں کی جھلیاں اور جامنوں کے ٹوکرے موجود تھے۔ بیگم صاحبہ نے

آم کا چھلکا ایک ارد بیگنی پر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا؟ وہ ہوئی ہے۔ کہ واہ واہ +

"پھر فیروزہ کمبخت جواب الگنی پر چڑھ گئی۔ سدا ہی کی چنچل تھی۔ بڑی اردبیگنی کا دوپٹہ چھپا دیا۔ بیگم بھی سمجھ گئیں۔ اب فیروزہ آگے آگے۔ اور وہ پیچھے پیچھے۔ بیگم صاحبہ کیسی ہنس مکھ تھیں۔ بڑھیوں میں بڑھیا۔ اور لڑکیوں میں لڑکی۔ اردبیگنی سے کہنی کیا ہیں "اری تجھے یاد بھی ہے۔ دوپٹہ اوڑھ کر آئی تھی"؟ مزہ یہ ہے کہ دوپٹہ سچ مچ ہی غائب ہو گیا۔ ادھر فیروزہ درختوں میں چھپا کر آئی۔ ادھر مالن پہنچی۔ اور دوپٹہ لے چلتی بنی۔ اردبیگنی کھلے سر دوڑنگے مارتی پھری۔ مگر دوپٹے کا پتہ نہ چلا +

"دن اس طرح گزرا کہ بات کرتے میں دوپہر بج گئی بھوک زور سے لگ رہی تھی۔ مگر بیگم صاحبہ جھولے میں جا بیٹھیں۔ اب جو چھوٹی جیدری لگی ہیں۔ تو سناٹا چھا گیا۔ بجار اور نہاری دونوں ملار اس مزے سے گائے کہ جی خوش ہو گیا۔ عجیب لطف تھا۔ وہ اتریں دو چڑھیں۔ دو بیٹھیں دو بیٹھیں ظہر کی نمازیں پڑھ کر کھانے بیٹھے نام تو پکوان کا تھا۔ مگر ہر نعمت موجود تھی"+

نیں۔ اے ہے لبتی۔ تو نے تو آج دل کھرچ لیا۔ بُوا وہ تو خواب تھا۔ اب جھولے ہی نہیں رہے۔ کچھ ایسی ہوا بدلی۔ کہ وہ سماں درہم برہم ہو گیا۔ بڑی بوڑھیاں لڑائی میں کو سا کرتی تھیں۔ الٰہی ایسی آگر پڑے۔ کہ سر کھجانے کی فرصت نہ ہو۔ وہ رنگ آج دنیا پر چھا گیا ہے جو ہے اپنی پڑی میں ایسا گرفتار۔ کہ آنکھ اٹھا کر دوسری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں +

مگر کیا دیکھا؟

دِلّی دیکھی۔ دِلّی والے دیکھے۔ گورے دیکھے۔ کالے دیکھے۔ بستی بستی کی رونق بستی والوں کے کارنمایاں۔ جو کچھ دیکھا دل کھول کر دیکھا۔ اور پیٹ بھر کر دیکھا۔ مگر کیا دیکھا؟ ایک قصبہ دیکھا۔ جس کے مرغزار۔ ایک گھر دیکھا جس کے درودیوار۔ عبرت کی داستان سُنا کر آٹھ آٹھ آنسو رُلا رہے تھے۔

چودھویں تاریخ کا چاند آسمان پر تھا۔ آدھی رات کے قریب گزر چکی تھی۔ اور دریائے جمنا قلعۂ شاہجہانی کو کناریں میں لئے لہریں لے رہا تھا۔ شہر کا چپّہ۔ چپّہ کسی کی دلہن بنا ہوا تھا۔ رعیت شاد دل آباد۔ بڈھے شاداں۔ بچے فرحاں۔ غرض ہر پیر وجواں ملک کی ترقی کا طلبگار تھا۔

سر بفلک عمارتیں دیکھیں۔ زمین دوز زیارتیں دیکھیں۔ دیسی دیکھے۔ بدیسی دیکھے۔ باجے دیکھے۔ گاجے دیکھے۔ مگر کیا دیکھا؟ وہ مکان دیکھا۔ جس کے مکین۔ وہ آسمان دیکھا۔ جس کی زمین اپنی کہانی سے سُننے والوں کے دل ہلا رہی تھی۔

تقاضائے شوق۔ اور مدّتوں کی آرزو گلی گلی اور کوچے کوچے لے گئی۔ مرحوم ذوق کے مکان کا پتہ اور نشان تک نہ تھا۔ ہر چند دل بیتاب تڑپا۔ مگر اس زمین کی خاک بھی میسّر نہ آئی۔ جو کبھی ملک الشعرا کا مسکن تھی

البتہ ایک جنگل تھا۔ ہُو کا میدان۔ جہاں ہر طرف سے یہ صدا آ رہی تھی:۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تاہم وہ گلیاں آنکھ کے روبرو تھیں۔ جن کے مقابلے میں دکن کا زروجواہر ہیچ تھا۔ قدم جن پتھروں پر پڑ رہے تھے۔ اُن کا اس وقت زبان حال سے یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا:۔

"کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر"

شہر کی چہل پہل۔ اور آبادی کی رونق سے فراغت پا کر ان لوگوں کا دھیان آیا۔ جو سرزمین جہان آباد پر علوم کے ایسے فانوس روشن کر گئے۔ جو مدتوں جگمگاتے رہیں گے۔ خاکِ دلی کا ہر ذرہ ان کے مقدس نام آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ اور گو ان کے فانی اجسام نیست و نابود ہو چکے تھے۔ مگر ان کی زندگیاں مٹ کر بھی آب و تاب سے چمک رہی تھیں +

شہر سے بالکل نکل کر دیکھا۔ تو ایک سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ بڑے بڑے تاجدار خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے۔ اور جن کے سینوں نے تخیل کے جواہرات سے خلق اللہ کو مالا مال کیا۔ آج ان پر پتھروں کا ڈھیر تھا۔

جہان آباد کھنڈروں پر ناز کر رہا تھا۔ جن میں لاجواب ہیرے اور موتی دفن تھے۔ جن کی آب و تاب آج بھی قمرِ چہار دہم کو شرمندہ کر رہی تھی +

رات بھیگ رہی تھی۔ اور جنگل سنسان تھا۔ مگر اب آنکھ کے سامنے وہ چمنستان تھا جس میں خوش رنگ پھول ہر چہار طرف کھلے ہوئے

تھے جو صرصر اپنے دامن سے ان مٹنے والوں کے مسکن پر جھاڑو دے رہی تھی۔ اور ماہتاب اپنے ہاتھ سے ان کے چراغ روشن کر رہا تھا۔
زندہ دیکھے۔ مردے دیکھے۔ قبروں کے ڈھیر دیکھے۔ قیامت کے پھیر دیکھے۔ مگر کیا دیکھا؟

وہ خاک دیکھی۔ جس میں تاج مُغلیہ کے گوہر آبدار دبے ہوئے تھے۔ اور وہ مقبرہ دیکھا جس میں ہمایوں جیسا تاجدار موت کا شکار ہوا پڑا تھا۔
شاہانِ مغلیہ کی عظمت و جبروت اور دنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھ کے سامنے تھا۔ عجب مؤثر سماں تھا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور پہلو کی قبروں سے یہ صدا سُنائی دی :-

"تاج مغلیہ کی بچی کھچی نشانیاں۔ ابھی چند بیگمیں دلّی میں موجود ہیں۔ جن کے ہاتھ کام۔ اور جن کی آنکھیں یاری نہیں دیتیں۔ مگر پیٹ ان سے دن بھر ٹوپیاں سِلواتا ہے۔ اور اس طرح یہ بدنصیب شہزادیاں ٹوپیاں اور عمدریاں سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں"۔

مظلوم کی فریاد

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم۔
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا غالب کا یہ شعر مشکل ہو یا آسان۔ مگر ہر لفظ کلیجے میں گڑنے والا ہے۔ اصل معنی کچھ ہی ہوں۔ مگر ہم تو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ایک بدنصیب بلبل صیّاد کے پھندے میں آپھنسی۔ بہار کا موسم تھا۔ باغ پھولوں سے مہک رہا تھا ہزاروں ارمان دل میں تھے۔ مگر صیّاد کے ظلم نے ساری اُمنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ باغ چھوٹا۔ پھول چھوٹے۔ آشیاں چھوٹا۔ اور ان سب کے بدلے قفس کی تیلیاں اور صیّاد کا آب و دانہ میسّر ہوا۔ بہتیرا سر ٹکرایا ہر چند پھڑپھڑائی مگر نہ رہائی ہوئی۔ نہ جان نکلی۔ اسی حالتِ یاس میں دن پورے کر رہی تھی۔ کہ صیّاد نے ایک اَور بلبل کو پکڑا۔ اور اسی پنجرے میں قید کیا۔ وہ دل جو مر چکا تھا جس کے تمام ارمان۔ جس کی ساری آرزوئیں بیرحم صیّاد نے ختم کر دی تھیں۔ ایک ہم وطن کی صورت دیکھ کر پھر تازہ ہوا۔ نئی بلبل سے ایک ایک کی خیر سلّا پوچھی۔ سرو کا درخت کس طرح ہے؟ گلاب کا پودا اچھا ہے؟ میرے آشیانی کی کیا خبر ہے؟

بلبل کو گرفتار باغ کا مفصل حال بیان کرتے کرتے اتنا کہہ کر رُک گئی

کہ کل میری گرفتاری سے کچھ دیر پہلے تیرے آشیاں پر بجلی گری۔ اور جلا کر خاک کر دیا۔ حسرت بھرا دل یہ سُن کر کہتا ہے۔ کہ پیاری بہن ڈبہیں صاف صاف کہہ۔ اب وہ آشیاں میرا نہیں ہے۔ میں کہاں اور وہ کہاں۔ نہ اس قید سے چھوٹوں گی۔ نہ آشیاں کی صورت دیکھوں گی +

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم۔
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو +

کم و بیش ایسی ہی حالت آجکل ہمارے ہاں بیویوں کی ہے۔ ایک خطبۂ نکاح نے ان سے تیرہ چودہ برس کے عزیز دم بھر میں چھڑوا دیئے۔ اور ایک شخص کے قبضے میں پہنچا دیا۔ جس کے اوپر زندگی کا تمام دار و مدار ہے +

ماں باپ غیروں کی طرح الگ ہو گئے۔ سہیلیاں۔ ہمجولیاں۔ بہنیں۔ بھاوجیں سب چھوٹیں۔ اور تقدیر نے ایک ایسے گھر میں لا ڈالا جس کی پہلے صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ سب کچھ کیوں؟ اس اُمید پر کہ سمجھدار شوہر قدر کریں گے۔ دیکھیں گے۔ اور سمجھیں گے۔ کہ یہ کون ہیں۔ کہاں سے آئیں۔ کیوں آئیں۔ انکو روٹی نصیب نہ تھی۔ کپڑے کو محتاج تھیں۔ رہنے کو جگہ نہ تھی۔ ماں باپوں کو دو بھر تھیں۔ آخر کوئی تو وجہ تھی۔ کہ جنہوں نے دکھ سہہ مصیبتیں جھیل کر پالا پوسا۔ وہ بالکل ہی لادوست ہو گئے۔ یا دم بھر آنکھ سے اوجھل کرنے کے روادار نہ تھے۔ یا مہینوں ہو جائیں اور آ کر خبر نہ لیں۔ ایک ایسے شخص کے اوپر سے جو ابتک قطعی غیر تھا۔ اپنے تمام حقوق قربان کر دیئے۔ اور جان بیچ کر سودا کیا۔ اگر ایسا سودا کرنے والے ٹوٹا بھگتیں۔ تو اُن کے بدنصیب ہونے میں کسے کلام؟

افسوس آتا ہے۔ اُن شوہروں کی حالت دیکھ کر جو بیوی کے معنی
ہی خدمت گزار کے سمجھتے ہیں۔ مانا کہ بعض جگہ بیویوں کی قدر وہ ہو رہی
ہے جو ہونی چاہئے۔ مگر ان سے بہت زیادہ جگہ وہ مٹی پلید ہو رہی ہے جو
نہ ہونی چاہئے۔ میاں۔ ساس۔ نند نندکے بچّے۔ دیور جیٹھ۔ اُنکی اولاد۔
غرض ان سب کو رضامند رکھنا۔ اس کا فرض۔ کوسنے فضیحتیاں طعن تشنیع
اس کا انعام۔ طلاق کا ڈراوا۔ دوسرے نکاح کی دھمکی۔ اسکی خدمتوں کا صلہ
جن بیچاریوں نے کبھی خواب میں بھی محنت نہ کی تھی۔ دن بھر پاپڑ بیلیں
ایک ایک کا آگا تاگا۔ ایک ایک کی للّو پتّو غرض زندگی کیا ہوئی وبال
ہو گئی۔ پکاؤ ریندھو۔ سیو پروؤ۔ جھاڑو بہارو۔ لیپو پوتو۔ غرض گھل گھل کر خاک
اور جل جل کر کوئلہ ہو جاؤ۔ مگر پھر کسی کے بھاویں نہیں۔ آنے جانے والے بھوہڑ
بتائیں۔ ملنے جلنے والے کیڑے ڈالیں۔ زبان دراز وہ۔ کام چور وہ۔ جل ججنی وہ
بدڈھنگی وہ۔ غرض کوئی عیب ایسا نہیں جو اعمال نامہ میں موجود نہو ناقص العقل
اس کا خطاب۔ بیوقوف اس کا لقب۔ مختصر یہ کہ کتّے کی زندگی اس سے بہتر
ہے جس کو موت کی کبھی تمنا نہیں ہوتی۔ یہ بحث۔ کہ جو بیویاں اپنے فرائض ادا
نہیں کرتیں کس سلوک کی مستحق ہیں۔ یا بیویوں پر شوہروں کے کیا حقوق
ہیں۔ آیندہ سہی۔ اس وقت تو افسوس اس کا ہے کہ آج نوبت یہاں تک
پہنچی۔ کہ بہت سے اللہ کے بندے بیویوں کے مقابلہ میں انسانیت ہی کھو
بیٹھے ہیں۔ ہمارے خیال میں کسی شخص کی آیندہ زندگی برباد کرنے سے زیادہ
نہ کوئی بڑا گناہ ہے نہ ظلم۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آئے دن یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔

اور پھر مزہ یہ۔ کہ کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں خوب کیا کہیں مذہب کی آڑ کہیں ضرورت کا بہانہ۔ اگر اسلام کے یہ معنی اور انسانیت کی یہ صفت ہے۔ تو اس اسلام اور انسانیت دونوں کو سلام۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ الٰہی بچائیو۔ اسلام کو اُن لوگوں سے جو اس کی ہنسی اڑائیں +

تعجب ہے۔ کہ ان کا ایمان ان کو کبھی ملامت نہیں کرتا۔ اور وہ نہیں سوچتے کہ ان کی اپنی تمام ضرورتیں پوری ہوں۔ مزے سے زندگی بسر کریں۔ کسی قسم کا غم پاس آ کر نہ پھٹکے۔ اچھے سے اچھا کھائیں۔ بہتر سے بہتر پہنیں عیش کریں۔ آرام کریں۔ غرض دنیا انکے واسطے جنت ہو مگر وہ بیگناہ روح جو ان ہی جیسی آدمی۔ ان ہی جیسی ضرورتیں رکھنے والی ہے۔ محض ان کی غفلت۔ خودغرضی اور نفس پرستی سے بدترین مخلوق ہو جائے اور ہوتے ہوتے نوبت یہانتک پہنچے۔ کہ موت کی منتظر اور زندگی جیسی نعمت سے بیزار +

یہ ہم جانتے ہیں۔ اور ہم کیا دنیا جانتی ہے۔ کہ کیسا ہی ظالم اور کتنا ہی کٹر آدمی کیوں نہ ہو۔ مرد ہو۔ عورت ہو۔ سنگدل ہو۔ رحمدل ہو۔ ظلم کی سزا نیکی کا بدلہ دُنیا میں نہیں ملتا۔ وہ شخص جو آپ چین کرتا اور مزے اُڑاتا پھرتا ہے۔ اگر اس کی بیوی دُکھ بھرے مصیبتیں جھیلے۔ اس کی بلا سے۔ اُس کے پاس سوا اس کے ایمان کے کوئی چیز ایسی نہیں۔ کہ اسکے کارنامے اسے سمجھا دے۔ جب وہ ایمان ہی نہ رہا۔ تو ڈر۔ حیا۔ لحاظ۔ انسانیت سب ختم ہوئے۔ اسکی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ وہ کیوں سوچنے لگا۔ کہ ایک مظلوم۔ نہی مظلوم جس کو میں نے کہیں کا نہ رکھا۔ جو سب کچھ مجھ پر سے لٹا بیٹھی۔ جس نے دُنیا کی

سب سے بڑی نعمت زندگی مجھ پر نثار کردی جس کو دنیا میں خوش رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا مجھے۔ میری وجہ سے تڑپ تڑپ کر دن اور بیٹھ بیٹھ کر راتیں بسر کر رہی ہے؟ اس کو کیوں خیال آئے کہ یہ دہکتی ہوئی انگیٹھیاں، یہ نرم نرم تکئے اور گرم گرم بچھونے مجھ پر حرام ہیں۔ اس لئے کہ وہ رنج و غم کی شریک عمر بھر کی ساتھی، دکھ درد کی رفیق جس سے نباہ کا وعدہ اور وفاداری کا اقرار تھا۔ آج جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں ٹھنڈے کپڑوں میں تارے گن گن کر کاٹ رہی ہے؟

زندہ ہیں ایسی بہت سی اللہ کی بندیاں جو آنکھوں میں رہیں۔ چاؤ چونچلوں سے پلیں۔ مگر وہ ساری اللہ آمین میکے ہی تک تھی۔ ظالم شوہروں کے پتھر دل اور سخت ہاتھوں نے کوار پتے کے ساتھ ہی دنیا کی بہار ختم کردی جو نگاہ محبت بھری معلوم ہوتی تھی۔ زہر میں بجھی نکلی جس دم سے قبر تک ساتھ دینے کی امیدیں تھیں۔ طوطے کی طرح دیدے بدل گیا +

یہ شوہر والی رانڈیں وارث رکھتی بے وارثیاں اور بیواؤں سے بدتر سہاگنیں اپنے دن پورے کر رہی ہیں۔ اور ان کے پھوڑا دل جنہوں نے اندر ہی اندر رس رس کر ان کو قبر میں جھکا دیں۔ ایک ایک صورت کو حسرت سے تک رہی ہیں۔ دنیا اُن کے لئے دوزخ ہے۔ اور کوئی اتنا نہیں۔ کہ ان دکھیاروں کی مدد کرے۔ مگر یہ مصیبت سدا رہنے والی نہیں۔ ایک زبردست مددگار کی توقع موجود ہے۔ دن اس کے انتظار میں گزر رہے ہیں اور راتیں اس کی راہ میں بیت رہی ہیں۔ قریب ہے کہ وہ سچا رفیق موت

اُن کی مصیبتوں کو ختم کر دے جس طرح میکے سے وداع ہو کر یہ سسرال آئیں۔ اسی طرح سسرال سے رخصت ہو کر قبر میں پہنچیں گی۔ دُنیا ان سے چھوٹ جائیگی۔ مگر یہ ایسی یاد چھوڑیں گی۔ کہ دنیا کے سننے والے اُن کے نام کو آنکھوں پر رکھیں گے ؛

(۲)

جو دُنیا رنگ برنگ کے جلوے دکھا۔ اور مزے مزے کی باتیں سنا رہی تھی۔ بیوفا نکلی جس عمر پر بڑا بھروسہ اور پوری تقویت تھی۔ پل مارتے میں ختم ہوئی۔ اور یوم الحساب سر پہ آپہنچا۔ دنیوی حکومتیں چار دن کا دورہ تھا۔ آج اس حقیقی بادشاہ کا راج ہے جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں۔ اور جس کے فیصلہ کا اپیل ہے نہ مرافعہ۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے تاجدار سرنگوں کھڑے ہیں۔ اور ہوا کانوں میں یہ صدا پہنچا رہی ہے:۔

"یہ ہے وہ دن جس میں بدلہ دینے کا وعدہ تھا"

ایک وسیع میدان مردوں عورتوں سے پٹا پڑا ہے فریادیوں کے غول سے دفعتہً عورتوں کا ایک گروہ علیحدہ ہوا۔ اور ایک عورت نے یہ فریاد شروع کی:۔

"بادشاہوں کے بادشاہ۔ بے وارثوں کے وارث۔ بدنصیبوں کی فریاد سن اور دُکھیاریوں کا فیصلہ کر ہم ہیں وہ کمبخت جن پر دُنیا کا عیش حرام اور جینا وبال ہو گیا۔ ہمارے سچے معبود۔ عمر کی کوئی گھڑی اور زندگی کا کوئی لمحہ سُکھ سے نہ گزرا۔ الٰہ العالمین شوہروں نے ہمیں دھوکا دیا۔ اور ہماری زندگی دوزخ

کردی۔ ان پیاروں سے توڑا جو ہم پر پروانہ تھے۔ ایسے پنجرے میں قید کیا
کہ عمر اپنی سر ٹکراتے بسر ہوئیں۔ دنیا کی کسی نعمت کا لطف ہمیں اٹھانا نصیب
نہ ہوا۔ ہم نے ان شوہروں کی اطاعت میں کمی نہ کی۔ نوکروں سے زیادہ
خدمت۔ اور عزیزوں سے بڑھ کر محبت کی۔ مر گئے اور ان کی آن بان
میں فرق نہ آنے دیا۔ کٹ جائے یہ زبان اگر ان کی شکایت کی ہو۔ اور
مٹ جائیں یہ ہونٹ اگر ان کو بددعا دی ہو۔ راتیں اس آرزو میں صبح
اور دن اس امید پر شام کئے۔ کہ ان کو ہماری حالت پر رحم آئے۔ مگر
اے آسمان و زمین کے بادشاہ ان کے مشغلوں نے انہیں اتنی فرصت
نہ دی۔ کہ یہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔ ماں باپ جیسی نعمت۔ عمر
جیسی دولت۔ بےفکری جیسی راحت ان کی نذر کی۔ گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا۔ برسوں
کا رشتہ توڑا۔ پیاروں سے منہ موڑا مگر اس کا پھل یہ ملا کہ سلگ سلگ کر
دن کاٹے اور جھلس جھلس کر وقت گزارا۔ یہ ہم کو عمر بھر رفیق رہنے کے وعدوں
اور قبر تک ساتھ دینے کے اقراروں پر لائے۔ مگر اے کمزور اور طاقتور دونوں
کے مالک رات کی سیاہی میں کالا بھنور آسمان ہمارے سر پر۔ ہیبتناک بجلی
چمکتی۔ بادل گرجتا۔ چور آتے۔ دیواریں گرتیں۔ دکھ ہوتے۔ بیماری ہوتی۔ اور
یہ سنگدل جو آج تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ دیوار بیچ مزے اڑاتے اور ہم سے
اتنا نہ پوچھتے۔ کہ کیوں کر گزری اور کیا گزری۔ اے عدل حقیقی کا وعدہ کرنے
والے حاکم۔ عمر اس امید پر ختم کی ہے۔ کہ آج تیرے دربار سے داد ملیگی۔ ہم مظلوموں
کی حمایت لے۔ اور وہ لوگ جو ہماری مصیبتوں پر ہنستے آج منہ نہیں دکھا دے

کہ جن کا کوئی نہیں اُن کا تو وہ جس کی تسبیح سمندر میں مچھلیاں ہوا میں پرند۔ جنگلوں میں درندے زمین پر آدمی۔ آسمان پر فرشتے کرتے رہے۔ تو وہ جس کو ہم نے دُنیا میں پوجا۔ آج دین میں ہمارے صبر کا اجر دے۔ لم یزلی اور ابدی تیرا راج۔ آج وہ دن ہے۔ کہ راجا پرجا۔ امیر فقیر۔ ظالم مظلوم۔ بیگناہ معصوم۔ شہ زور کمزور سب تیرے فیصلہ کا مُنہ تک رہے ہیں۔ دلوں کا حال جاننے والے بادشاہ رہ رہ کر ہوک اُٹھتی ہے۔ کن بیدردوں سے پالا پڑا تھا۔ کہ خوشی کی صورت نام کو نہ دیکھی۔ اے بیکسوں کے والی۔ تو گواہ ہے۔ کہ فاقوں سے دن گزرے۔ پیوندوں کی نوبت آئی۔ ایک ایک پیسہ ایک ایک اشرفی ہو گیا۔ بیمارتی کی راتیں پہاڑ ہو گئیں۔ مگر ان تیرے بندوں کا دل نہ پسیجا۔

"سچے معبود ہمارے دُکھے ہوئے دل تیرے حضور میں فریادی آئے ہیں۔ دکھا دکھا۔ اے سچے معبود دکھا دے۔ کہ مظلوموں کا وارث اور بیکسوں کا والی تو ہے!"

چاندنی چوک کا جنازہ

اٹھارھویں کی شام کو جب سلطان جی کی سترھویں ختم کے قریب تھی خلقت سیر سپاٹے سے۔ اور دکاندار اپنی بکری سے فارغ ہو ہو کر چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مدرسے کی جانب سے اس غضب کی سیاہ گھٹا اُٹھی۔ کہ چاروں طرف اندھیر گھپ ہو گیا۔ جو کہیں برس جائے تو چھاجوں ہی تھا۔ بے وقت کا بادل۔ بے موسم کی گھٹا۔ شان گمان بھی تو نہیں ہر شخص متعجب تھا۔ سیر کے رسیلے اور شہر کے چھبیلے مگن تھے۔ مگر دکانداروں کی سٹ ہی سٹ پر جان تھی۔ گھٹا کیا بجلی اور چھلاوہ تھی۔ کہ پلوں اور لمحوں بڑھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف چھا گئی۔ اِکا دُکا بوندیاں پڑیں۔ مگر چھڑکاؤ بھی نہ ہوا۔ کہ ہوا لے اڑی۔ ہوا کیا خاصی زور کی آندھی تھی۔ آسمان اور زمین سب خاک میں اَٹ گئے۔ سائبان اور تنبو پردے اور چلمنیں کہیں پہنچیں کہیں گھسٹے گرے۔ فانوس لڑھکے۔ ہنڈیاں ٹوٹیں۔ غضب یہ تھا کہ اس پر بھی جھکڑ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ لوگ جاتے جاتے رک اور چلتے چلتے تھم گئے خاک تیر کی طرح گھس رہی تھی۔ آنکھ میں اور منہ میں کان میں اور ناک میں خاک کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ اب تو بیفکروں کے بھی دم پر بنی۔ ابر کی صورت دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے تھے۔ مگر آندھی نے وہ بکھیڑے دکھوں میں جھونکے

کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے اندھیاؤ کم ہوا۔ ہوا بھی ہلکی پڑی۔ تو سودے والوں نے اپنے چھبیوں۔ دکانداروں نے اپنی دکانوں۔ اور سیلانیوں نے اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال شروع کی۔ کہ ستھرعویں میں کیا کھویا اور کیا کھویا؟

شام کا وقت تھا اور شمع آفتاب جھلملا رہی تھی۔ مگر ستھرعویں کا بازار میدان حشر کا نمونہ تھا۔ کہ ہر سمت نفسی نفسی کا عالم تھا۔ کوئی خوش تھا، اور اُچھل رہا تھا۔ کہ ابر اور طوفان دونوں سر سے گزر گئے۔ مگر رتی بھر نقصان نہ ہوا۔ کوئی سر پکڑے رو رہا تھا۔ کہ نفع تو گیا خاک میں عمر بھر کو رو نگھٹا رو نگھٹا بندھ گیا۔ کہ مانگے تانگے کے لیمپ اور جھاڑ چکنا چور ہو گئے۔ اس منظر میں سب سے زیادہ تعجب انگیز کیفیت یہ تھی۔ کہ خوش ہونے والے اپنے محفوظ رہنے سے زیادہ دوسروں کے نقصان پر نہال نہال تھے۔ مجمع قریب قریب مسلمان تھا۔ اور افراد شاد کام کا یہ جذبہ کہ وہ بدنصیبوں کی صورت دیکھ دیکھ کر ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ اسلام کے دور حاضرہ کی پوری تفسیر تھا۔

جھٹ پٹا سا ہو گیا تھا۔ کہ ایک شخص پانوں کی سرخی جس کی باچھوں تک پھیلی ہوئی تھی بسنتی چادر بغل میں دبائے ہنستا ہوا ایک مسلمان حلوائی کی دکان پر آیا۔ اور کہنے لگا۔ "کہو بھئی اُستاد کلّن تم پر کیا بیتی؟"

کلّن۔ ارے بھائی میں تو بن آئی مرا۔ کھٹے لُٹ گیا۔ گرہ سے تو خیر جو جانا تھا وہ گیا ہی۔ یہ کیسی پڑی۔ کہ مولا کے دونوں شیشے اور چچا نصیرو کا لیمپ کرچی کرچی ہو گیا۔

کھبتی۔ یاں تو اُستاد اللہ کا شکر ہے۔ نلوہ بچے۔ منڈہ تو تم جانتے ہو ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ سے مِیَہ رہا ہے۔ خلیفہ سے کہا۔ وہ کانوں پر ہاتھ دھر صاف نالوٹ ہو گئے۔ ہم نے سوچا۔ کہ مرتی جاتی دنیا ہے۔ آج مر گئے کل دوسرا دن۔ کیا خبر دوسری سترھوں آئے نہ آئے۔ یہ تو زندگی کے میلے ہیں۔ منڈہ سندہ تو چلا ہی جائیگا۔ آ کا بودی کو ٹٹولا۔ وہ اس گھر کہاں؟ بندو کو راگ دیا۔ وہ ڈھپ پہ نہ چڑھے ✤

قصہ کوتاہ۔ تم سے پردہ نہیں تین روپیہ ہار لمڈے کے ٹن بُھدائے۔ بھابجی کا چادرہ لیا۔ ابّو کی صدری لی۔ بوندیاں پڑتے ہی مسلمان ہو تو یقین کرنا۔ میری تو جان نکل گئی۔ کہ یہ مانگے تانگے کے کپڑے برباد ہوتے۔ مگر وہ تو یوں کہو۔ اللہ نے بڑا فضل کیا۔ کہ آندھی آ گئی ✤

کلّن۔ ابے میری جان پر بن رہی ہے۔ تو اپنا جھگندن لے بیٹھا۔ یاں تو آندھی نے قیامت کر دی۔ تو کہہ رہا ہے۔ بڑا فضل ہوا ✤

کھبتی۔ بھائی اپنے سے خوب خدا۔ ہم پر تو اُس نے فضل ہی کیا۔ نہیں تو عمر بھر کی ناموشی تھی۔ چادرہ بھی بھابجی کا نہیں۔ اُسکے میاں کا۔ اور ابّو کو تو تم جانتے ہو۔ داماد کا بھائی ہے ✤

کلّن۔ ابے تو آگے بڑھ۔ میری کیوں جان کھائی؟ یاں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ منہ دکھانے کو جگہ نہیں۔ تجھے اپنی ٹر ٹر سے کام ہے ✤

کھبتی۔ اماں تم گھبراتے کیوں ہو؟ مولا کوئی ہیّا تھوڑی ہے۔ تقدیر میں نقصان لکھا تھا جن چیزوں کو ٹوٹنا تھا وہ یہاں کیا وہاں بھی ٹوٹتیں۔ اور

نسبات پر دوں میں ہوتیں تو ٹوٹتیں ؛
کلن - اچھا کھٹے لے اب تو آگے بڑھ زیادہ باتیں نہ بنا ؛

رات چاندنی تھی۔ شمع آفتاب گل ہو کر بساط فلک پر قندیل ماہتاب روشن ہوئی۔ ایک بڈھے پھونس بزرگ لکڑی کا سہارا لئے ہوئے ٹہلتے ٹہلتے ایک دکان کے قریب پہنچے اور کہا :-

" میر صاحب ابھی دکان بڑھائی نہیں ؟

میر صاحب - میرزا جی کیا عرض کروں اس سفید داڑھی کو کلنک کا ٹیکا لگنا تھا لگ گیا۔ نوے برس کی عمر ہونے کو آئی نرم گرم سب ہی طرح کے وقت دیکھے۔ مگر داڑھی کا احسان کسی کا نہ اٹھایا۔ سارا بازار اور محلہ بھرا پڑا ہے۔ کسی کا شرمندہ نہیں۔ ہاں آج چوک ہو گئی ؛

میرزا جی - کیا کسی اور کا مال لے آئے تھے ؟

میر صاحب - جی نہیں مال تو اپنا ہی تھا۔ میں تو میرزا جی پرائے مال سے ہزاروں کوس دور بھاگتا ہوں۔ مگر ہونی شدنی۔ میاں نظیر نے زبردستی یہ لالٹین ساتھ کر دی تھی۔ وہ چور چور ہو گئی ؛

میرزا جی نے جیب سے ڈبیا نکال کر میر صاحب کو پان دیا۔ بٹوئے میں سے چھالیہ اور زردہ دیا۔ آپ کھایا۔ ان کو کھلایا۔ اور کہا " میر صاحب جس طرح ہو پیٹ سے پٹی باندھو۔ اور نئی لالٹین پہنچا دو۔ مگر یہ مزا یہ ہے کہ نظیر کو پتہ نہ چلے ؛

میر صاحب۔ دیکھئے اللہ مالک ہے ارادہ تو یہی ہے ؂

میرزاجی۔ اب تو دنیا ہی اَور ہو گئی۔ شرم لحاظ سب اُڑ گئے۔ وہ بیحیائی ہے۔ کہ دیکھنے میں آئی نہ سُننے میں ؂

میر صاحب۔ ایک شرم ہی کو کیا روتے ہو۔ سب چیزیں بدل گئیں۔ وہ لوگ ہی نہ رہے۔ وہ باتیں ہی نہ رہیں۔ اب تو دیکھ دیکھ کر اوسان اُڑے جاتے ہیں۔ شہر کیا لُٹا وہ باتیں ہی کٹ گئیں ؂

میرزا جی۔ ہائے سید کیا بات کہی ہے! شہر کی آبادی جنت تھی۔ اللہ اللہ کیا وقت تھا اور کیا لوگ تھے۔ آنکھیں ان صورتوں کو ترس گئیں۔ اور دل اُن باتوں کو ترس گیا۔ ہم بدنصیب تھے کہ رونے کو رہ گئے۔ اور مزہ یہ ہے کہ اسے ترقی کہتے ہیں۔ اَور تو اَور شہر کی حالت دیکھو کیا ہو گئی ؂

میر صاحب۔ اے ہے۔ میرزا کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ شہر آبادی کا سماں آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ کیا چہل پہل تھی۔ جس طرف نظر اُٹھاؤ۔ رونق ہی رونق تھی۔ شہر دُلہن بنا ہُوا تھا۔ خدا کی مار ایسی ترقی کو۔ چاندنی چوک میں جس وقت ہرے بھرے درخت جھومتے تھے۔ جنّت کا مزا آتا تھا۔ بیچ میں نہر بہتی تھی۔ ترکاری والوں کی سُریلی تانیں۔ بلبل خوش الحان کا لطف دیتی تھیں۔ ادھر اُدھر قسم قسم کے درخت بیچ میں نہر۔ اور پھر کنجڑوں کی صدائیں۔ بھانت بھانت کا جانور بولتا تھا۔ جاڑے کی گرمی میں دن بھر پھرتے جاؤ۔ آج درخت کٹ کٹا کر چوک لنڈورا ہو گیا۔ کوسوں سایہ کا پتہ نہیں۔ اُلّو بول رہا ہے کیسی بنی ٹھنی دُلہن رانڈ ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں اجڑ کر بسی

میں کہتا ہوں کہ ایسی اُجڑی کہ اب صدیوں پنپنے کی اُمید نہیں۔ یہ ہی چوک تھا کہ شام کو کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ آدمی پر آدمی گرتا تھا۔ چوک کی شام روز کا میلہ تھا۔ جہاں تک نظر دوڑاؤ آدمی ہی آدمی تھا۔ شادو گگڑ والا نوگزہ نیچہ لئے شعر پڑھ رہا ہے۔ خونچے والے لہک رہے ہیں۔ موتیا مہک رہی ہے۔ لپٹیں آرہی ہیں۔ کیا رنگ تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اب میرزا یہ غضب بھی سُنا۔ کہ کسی کو اتنا حکم نہیں۔ کہ خونچے کی آواز تک تو نکالے۔ وہی چوک ہے اور وہی دکانیں۔ پٹڑیاں بھی بن گئی ہیں۔ آنے جانے کے رستے بھی الگ ہو گئے ہیں۔ پکڑ دھکڑ کو سپاہی بھی موجود ہیں۔ ذرا کوئی نیچے اُترا اور ہا یوب کی آواز آئی۔ لیکن خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ چوک میں جا کر کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ایسا لٹا کہ گدھے کے ہل پھر گئے۔ جب درختوں کی ڈھایا ڈھوئی ہو رہی تھی میں بھی شامت کا مارا ایک دن جا نکلا مسلمان ہو تو یقین کرنا۔ پھاوڑے کی ہر چوٹ میرے سینہ پر تھی۔ آنسو نکل آئے۔ خدا کی قدرت کا تماشا دیکھتا رہا۔ میرزا ان آنکھوں نے بہت دیکھا۔ غدر کی مصیبت قیامت سے کم نہ تھی محل کے رہنے والوں کو بھلے واسے لالوں کو پری وش مہ جمالوں کو فاقوں میں تڑپتے دیکھا۔ بھائیوں کی لاشیں دیکھیں۔ جوان لڑکوں کو قبر میں رکھا۔ مگر یہ خبر نہ تھی۔ کہ ان آنکھوں سے چاندنی چوک کا جنازہ دیکھنا پڑیگا۔

ہائے میرزا کیا تھا اور کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔"

میرزا۔ اے سید کلیجہ مگھوچ دیا۔ شہر آبادی کا تختہ پھولوں سے پٹا تھا۔ ایسا لُٹا کہ کانٹے تک خاک میں مل گئے۔ جدھر جاؤ اللہ ہی اللہ ہے گھوڑوں

ادھر کنّوں کی دُموں پر ہنستے ہی تھے۔ یہ خبر نہ تھی کہ چوک لنڈورا ہوکر چٹیل میدان بن جائیگا۔ اور دونوں طرف کو لکیوں کی قطاریں رہ جائیں گی چوک کے دلّی والوں کے ماں باپ تھے۔ بچّے ان کے سائے میں لوٹ پوٹ کر جوان اور کھیل کود کر انسان ہوئے۔ ہائے احمد اللہ کا بڑ ہماری جان تھا۔ ڈالی ڈالی اور پتّہ پتّہ بچپن کا رفیق اور لڑکپن کا ساتھی۔ جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں اس پر چڑھ چڑھ کر نہر میں کودتے تھے۔ ہمارا دل دیکھو۔ کہ ہمارے سامنے بڑ اور نہر دونوں کی اینٹ بج گئی۔ آج اس کا نام و نشان تک نہیں۔ ہم تو چاندنی چوک کی فاتحہ پڑھ چکے۔ اب خدا وہاں نہ لے جائے۔ وہ دن اور راتیں سب ہوا ہوگئیں۔ اب بھی خیال آتا ہے۔ دل تڑپ جاتا ہے میرزا کیا سماں تھا۔ ہائے ہائے کھجور والا بھانہ تو یاد ہوگا بارہ بجے رات کے جس وقت چوک میں آواز لگاتا تھا:۔

"شیدی کنور کے باغ کا بھدانہ"

وہ اس کی بھنبیری آواز اور جھاّ جھاّ کر لہک لہک کر شیدی کنور کے باغ کا بھدانہ کہنا دل کے پار ہوتا تھا۔ سچ ہے۔ کہ کھجوروں کا تو فقط بہانہ تھا قیمت تو آواز کی تھی۔ مرد تو مرد عورتیں اور بچّے تک مشتاق رہتے تھے۔ ظالم نے اس غضب کی آواز پائی تھی۔ کہ اندر بیٹھتی تھی۔ آدھی رات کے سناٹے میں جادو کرتی تھی۔ پورا ہوئی تو کھاری باؤلی اور بتاشوں کی گلی پہنچ گئی پچھوا میں نیل کا کٹرا اور بلّی ماروں کا محلّہ خلقت ہے کہ پروانوں کی طرح گر رہی ہے۔ ادھر رات کے بارہ بجے ادھر بھانے نے صدا لگائی۔ مال تو سا کر کے کوئی ڈیڑھ سوا کے قریب ہوتا

ہوگا۔ جو پھاٹک تک ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مگر واہ رے بھانا مال ہو یا نہ ہو، سکو
چوک چاوڑی اور لال کنوئیں کا چکر کاٹنا۔ سید ہم تو اس وضعداری پر مرتے ہیں
کھنے کو دو کوڑی کا کنجڑا تھا۔ مگر آج رئیسوں میں اس آن کا پتہ نہیں۔ جانتا تھا
کہ شہر آواز کا عاشق ہے۔ مرتے دم تک وہ وضع نہ چھوڑی۔ پھر دیکھ لو اُس
کی ارتھی کے ساتھ خلقت اُمنڈ رہی تھی۔ سید۔ ارے میاں ہماری تو وہی
مثل اصل ہو گئی۔ کہ اونٹ بے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی؟ جدھر نظر
اُٹھاؤ رنگ ہی اَور ہے۔ کچھ ایسا زمانہ پلٹا ہے۔ کہ ہوا ہی کچھ اَور ہو گئی۔ ہم بد
نصیب اُس دن کو رہ گئے تھے۔ کہ یہ سانگ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ چوک
کیا لٹا شہر کی روح نکل گئی۔ ان درختوں کے نیچے ایسے ایسے بلبل چہکے ہیں
کہ اب تک اُن کی صدائیں کانوں میں بھری ہیں۔ بھائی چوک کو نظر کھا گئی۔ بنگرا
عنایت تو تم کو یاد ہو گا۔ کس مزے سے لہکتا تھا۔ کہ بے ضرورت سودا لینے
کو جی چاہے۔ جھلیاں ہری ہری ترکاریوں سے بھری پڑی ہیں۔ گرمی
میں شام کے وقت اُس کی آواز

"دو ہی گھڑی کا توڑا اُبھرتہ ہی والا ہی لینا مارو ہے" +

کیسی رسیلی آوازیں تھیں۔ کہ معمولی چیزوں کو چار چاند لگ جاتے تھے
چوک تو خیر اُجڑ ہی چکا۔ اب جو ایک دن مٹھائی کے پُل پر جا نکلا۔ تو یہی
مارو بیگن بک رہے تھے اور ایک گنوار آواز پکار رہا تھا:۔

"بینگن لے لو بینگن"

عنایت کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جی میں آیا منہ نوچ لوں۔ بھلا یہ

سرزمین بائیس خواجہ کی چوکھٹ اس قابل تھی۔ کہ اس پر ایسے ایسے ستم ٹوٹیں؟
میرزا۔ واہ واکیا چیز یاد دلائی ہے۔ لنگڑا عنایت سبحان اللہ۔ ارے میاں ایک عنایت ہی پر کیا موقوف ہے۔ جب چوک آباد تھا۔ تو وہ ٹولی کی ٹولی ہی کمال کی تھی۔

"نانی کے نواسے خون کے پیاسے شربت کو"۔

سید پہیلیاں ہیں پہیلیاں۔ اب تو ان کے بوجھنے والے بھی مٹ چکے۔ ان آنکھوں نے وہ سماں بھی دیکھا۔ اور اب یہ بھی سنتے ہیں:-

"فالسے ہیں جی فالسے"

اب پھر چند لمحے تک دونوں پر خاموشی طاری تھی۔ برابر کی جھونپڑی میں ایک بڈھا ساقی جس کی پلکیں تک سفید تھیں حقہ گڑگڑاتا ہوا باہر نکلا سلام علیک کی۔ حقہ میرزا جی کو دے کر ایک ٹھنڈا سانس بھر بیٹھ کر کہنے لگا:۔
"ہائے چاندنی چوک۔ یہ ستم تو کہیں نہ ہوا ہوگا۔ قصوروار تو شہزادے اور بادشاہ زادے تھے۔ شہر غریب لینے میں نہ دینے میں۔ مگر واہ ری تقدیر ایسا پھاوڑا پڑا۔ کہ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سب سے پہلے تو فصیل کو لو دلہن کا اصل گہنا تو وہ تھا۔ مگر ایسا دہاکا پڑا۔ کہ تابنے کا تار تک نہ رہا۔ دو لوٹے گرج اب بھی کھڑے رو رہے ہیں۔ سو وہ بھی برس چھ مہینے کے مہمان ہیں پھر تو یہ بھی پتہ نہ چلے گا کہ فصیل تھی کہاں۔ میاں سوکھ کر قاق ہو گیا ہوں ہاتھ پیروں میں سکت نہیں۔ بات کرتا ہوں۔ تو سانس بھول جاتا ہے۔ مگر جب سنتا ہوں کہ شہر کے نصیب جاگ گئے۔ غنچہ بنا دیا۔ تو ان سوکھی ٹہنیوں

ہیں آگ لگ جاتی ہے۔ کہنے والے بھی ایرے غیرے دیسی بدیسی۔ الائے
ہتنے شہر والوں کے دل سے پوچھو۔ تلملاتے رہ گئے۔ پارک کیا اگر جنت بھی بنا
دو تو وہ بات نصیب نہیں فصیل کا زخم ابھی بھرا نہ تھا۔ کہ چوک کے پچوکوں
نے غضب ڈھا دیا۔ کیا پوچھتے ہو۔ سو برس کی لپیٹ میں ہوں تم دونوں
سامنے کے بچے ہو۔ خدا کی قدرت ہے مجلا ہو گئے۔ میری آنکھیں وہ کچھ دیکھ
چکی ہیں۔ کہ اب کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جن درختوں کو دھڑی دھڑی کر کے غارت
کیا۔ اُن کی قدر ہمارے دل سے پوچھو۔ میاں میرزا برسات کے دنوں میں
جو مزہ چوک کے درخت دے گئے ہیں۔ اس پر ایک نہیں ہزار پارک ہوں
تو قربان۔ اب چاروں طرف سے آواز آتی ہے۔ بھارت ماتا کے سپوت
بھارت ماتا کے لال۔ مگر بھائی ہماری بھارت ماتا کے لال ہمارے چوک
کے درخت تھے۔ جن کے ملنے کی قیامت میں بھی امید نہیں۔ کہتے ہیں
کہ پھانسی کے وقت خونی سے پوچھتے ہیں۔ بتا کیا چاہتا ہے۔ مجھ سے ملک الموت
نے پوچھا۔ تو کہونگا "ایک دفعہ چوک کو پھر اُسی شان میں لدا پھندا دکھا کر
روح قبض کر لو"

رات آدھی کے قریب گزر گئی۔ اور یہ تینوں بڈھے بیٹھے دہلی کا مرثیہ
پڑھ رہے تھے۔ کہ فسانۂ چہار درویش کے چوتھے درویش کی طرح ایک
بڑھیا ہانپتی کانپتی آئی۔ اور میر سے کہا۔ دو پیسے کے . . . .
سید کی عقل زائل تھی سُنا بھی نہیں۔ اور بدستور جہان آباد کے نوحہ میں مصروف

ہو گئے۔ بڑھیا بھی اپنی ضرورت کو بھول گئی۔ اور تینوں کی باتیں سننے لگی۔ جب اُنکی گفتگو میں سکوت ہُوا۔ تو بڑھیا بولی: "جیسا شہر کا بڈھا بگڑا خاد دشمن کا نہ بگاڑے۔ بسا بسایا کر مارا۔ فصیل توڑی۔ چوک مٹایا۔ ارے میاں دِلّی کا بنا دُرد و لھا کے دم سے تھا۔ اُس کے جاتے ہی سہاگ اُجڑ گیا۔ تم کو تو کیا یاد ہوگا۔ بہتر برس کا ذکر کرتی ہوں۔ باغ دیوار کی نکڑ پر جہاں اب منڈوں کی دُکان ہے۔ خوجم صاحب نیچے باندھتے تھے۔ کہنے کو تو آٹھ پیسے کے نیچے بندھے مگر سبحان اللہ خوجم صاحب جبتک جئے۔ دُکان کو چمن بنائے رکھا۔ گرمیوں میں کورے کورے مٹکوں پر سوندھے آبخورے۔ بیلوں والے کنوئیں کا پانی خلقت ٹوٹ رہی ہے۔ مگر کیا مجال کہ پانی کا توڑا ہو جائے۔ دس مٹکے اور دسوں لبالب۔ ادھر عصر کی اذان ہوئی۔ اُدھر خوجم صاحب نے اوزار بڑھائے سنہری مسجد میں نماز پڑھی۔ اور آکر بیٹھے۔ اب چھبیلوں کا جگھٹا شروع ہُوا۔ خواجہ صاحب کی گنگا جمنی پنکھیاں۔ شربتی کے مہین انگرکھے۔ ایک دن شعر ہیں۔ دوسرے دن داستان تیسرے دن مرثیاں۔ چوتھے دن بانیاں۔ گیا بجے تک میلہ لگا رہتا تھا۔ نہر میں نہاؤ۔ درختوں پر چڑھو کس کی مجال ہے۔ کہ الف سے بے تو کہہ لے۔ ایک چوک کیا سارا شہر اپنا تھا کمیٹی تھی نہ سمیٹی۔ جہاں چاہے بیٹھو۔ جہاں چاہے لیٹو۔ اب تو بنے وہ مثل ہے۔ پرایا گھر تھوک کا ڈر۔ ذرا ٹیڑھا پیر پڑا۔ اور برقنداز نے بھبکی دی۔ چوک کی برسات ہائے ہائے بیگم کے باغ میں چھڑے لوٹ لئے وہ ہم سے پوچھو۔ ذرا چھینٹا پڑا اور چوک کے درختوں نے قلب کا مزہ دیا۔ دُھلے دُھلائے کھڑے جھوم رہے ہیں۔

اور ہماری جان میں جان آرہی ہے۔ یہ لال لال مکان جواب بنچ یا سنیچ کیا کہلاتا ہے۔ غنچہ تھا۔ یہاں جا بیٹھے اور کڑھائیاں چڑھادیں۔ گرم گرم سموسے اور پوریاں اُتر رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ چوک والے حافظ جی کے کباب تیار ہیں۔ ادرک اور پیاز کا لچھا۔ سبحان اللہ۔ یہاں سے اُٹھے نہر پر پہنچے۔ نہر سے اُٹھے درختوں کے نیچے۔ اب تو بھائی شہر کی نہر نہ باغ کی درختوں کے کٹنے کی آواز تو مدتوں سے کان میں آرہی تھی۔ مگر خدا کو جان دینی ہے۔ کس بے ایمان کو یقین آتا تھا۔ سدا یہ سمجھا۔ کہ سیلانیوں کی گپ ہے۔ ایسا بھی کیا اندھیر ہے۔ کہ چوک میں گدھے کا ہل پھرے گا۔ ایک دن جو ٹکے کی افیم لینے گئی۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ کھچا کھچ آرہ چل رہا ہے۔ اور اس سرے سے اُس سرے تک درخت گرے پڑے ہیں۔ سناٹا آگیا۔ کہ یہ کیا مصیبت ٹوٹی۔ آنسو نکل پڑے۔ بھائی یہ شیشم کی ایک ٹہنی لاکھ سوکھ کر کھڑ ونک ہو گئی مگر اُن درختوں کی نشانی ہے۔ یہ توڑ کر ساتھ لے آئی۔ وہ دن اور آج کا دن جل جائیں یہ پاؤں اگر چوک میں قدم رکھا ہو۔ ہاں یہ ڈنٹھل جان کے ساتھ ہے

بڑھیا ابھی زندہ ہے۔ اور مرجھائی ہوئی ٹہنی گلے کا ہار۔ آباد دہلی کو دیکھ کر خوش ہونے والے اگر اس تنکے کی کچھ وقعت سمجھیں جس میں چوک کی پوری تاریخ دفن اور دہلی والوں کا دماغ مضمر ہے۔ تو کبھی اس کو بھی آکر دیکھ لیں ؎

دارالغرور

سروالٹرسکاٹ کا یہ خیال کہ تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں۔ جو یکساں ہوں۔ اینتھروپومیٹری کی اس تحقیقات سے اور بھی پختہ ہوگیا کہ جس طرح انسان باعتبار شکل وصورت ظاہری مطابق نہیں۔ اسی طرح ساخت اعضا بھی مختلف واقع ہوئی ہے۔ تھمب امپرشن یعنی دو شخصوں کا انگوٹھے کا نشان خواہ وہ شہری ہوں یا دہقانی۔ جرمنی ہوں یا زابلتانی آپس میں مطابق نہ ہوگا۔ وقس علیٰ ہٰذا یہ ہی اختلاف طبائع انسان میں موجود ہے۔ خیال مختلف۔ رائیں مختلف۔ مذہب مختلف۔ یقین مختلف۔

دنیا کے دارالعشرۃ اور دارالغرور ہونے پر ہر طبقہ اور قوم کے اہل قلم نے مختلف خیال ظاہر کئے۔ مگر ایک شخص واحد کا خیال استدلال کیواسطے کافی نہیں ہوسکتا۔ امر متنازعہ فیہ کے فیصلہ قطعی پر دیکھنا یہ ہے۔ کہ جماعت کا مذہب کیا ہے۔ اور سوسائٹی کا رجحان بیشتر کس طرف ہے!!!

امیجی نیشن یعنی قوت متخیلہ نے بسا اوقات ایسا بھی کیا ہے۔ کہ ایک ہی شخص ایک ہی صنعت کے معنی کرنے میں متفرق اوقات میں مختلف الخیال ہوگیا۔ گو یہ صورت شخص متعلق کی غلط فہمی سے زیادہ صنعت کے مختلف الشکل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ شکیپئیر جو ایک جگہ انسان اور حیات انسان کے واسطے اچھے نقشہ لکھ رہا ہے۔ دوسری جگہ تماشاگاہ عالم کو ایک تھیئیٹر قرار دیکر

اسی انسان کی بابت لکھتا ہے :-

"سب سے آخر سین بڑھاپے کا ہے جو اس تمام کائنات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور یہ وہ وقت ہے۔ جب ذائقہ اور زبان۔ آنکھ اور کان سب وبال جان ہو جاتے ہیں"۔

دیکھنا صرف یہ ہے۔ کہ دار العشرۃ اور دار الغرور دونوں میں بحیثیت مجموعی اطلاق جائز کس کا ہو سکتا ہے؟ اس بحث میں مختلف اہل قلم کے خیالات پر نظر ڈالنی ہے +

ایک سمندر پار کا رہنے والا دنیا سے اس طرح مخاطب ہو رہا ہے:

"آہ! لا ابتہ دنیا تیرا منظر کیسا دلفریب ہے!

"تیری خوشیاں بہت ہیں۔ اور ہر خوشی نئی ہے +

"آہ پیرزال! تیری کون سی چیز پرانی ہو گئی!

"کسقدر تیری خوشیاں! اور وہ تھوڑی بھی کب تک" (کریب)

"اس دنیا نے مجھ کو مار ڈالا"

"دن کی روشنی اور سورج سب تکلیف دہ ہیں" + (ایڈیسن)

شیکسپیئر اپنے ایک مشہور ڈرامے مرچنٹ آف وینس میں کہتا ہے :-

"دنیا ایک اسٹیج ہے۔ جہاں ہر شخص اپنا پارٹ کر رہا ہے۔ اور سب سے زیادہ درد انگیز میرا ہے"۔

مرحوم داغ فرماتے ہیں :-

دُنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم

کن نعمتوں کو حکم ملا ہے جواز کا
جو لوگ یہ کہتے ہیں جہنم دُنیا۔
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں
(حالی)

جن لوگوں نے بہشت شداد طلسم نمرود وغیرہ کو آنکھ سے دیکھا فطرت انسان متقاضی تھی۔ کہ ان کی انتہا نظر اور خاتمہ عقل اسی حد پر ہو جاتا۔ کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ بہشت شداد کے دیکھنے والے جنت آسمانی کا یقین کر لیتے۔ یہ تقاضا سرشت آسمانی تھا۔ کہ آخر بنی اسرائیل کہہ بیٹھے لَنْ نُؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہْرَۃً (ہم جبتک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں یقین نہ کرینگے) دائرہ مذہب سے باہر نکل کر ایک آدمی مافوق الفطرۃ امیدوں کو ڈھکوسلا بتا کر یہ کہہ دے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تو فطرت انسانی کے بموجب وہ کس گناہ کا مرتکب ؟ جہاں تک اسکی عقل نے رہبری کی وہ پہنچا جب عقل ہی جواب دے چکی۔ تو اب کیا کہنا اور کیا کرنا ؟ وہ مصیبت زدہ جس نے تمام عمر رنج و افلاس میں بسر کی۔ نہ پیٹ بھر کو ٹکڑا۔ نہ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا جنازے ڈھوتے ڈھوتے کندھے شل ہو گئے اور کفن دیتے دیتے دل مردہ ہو گیا۔ اس سے یہ کہنا کہ مرچکنے کے بعد ساتویں آسمان پر تیرا مقام جنت الفردوس میں تیرا قیام۔ غلمان کے پڑوس میں تیرا گھر حوروں کی گودیں تیرا سر۔ آنکھ بند کرنے کی دیر ہے۔ دوسرے جنم میں ہفت اقلیم کی بادشاہت تیری ہے۔ ادھر دم نکلا۔ ادھر روح القدس کا ساتھ ہوا فطرتاً یہ

کلمات موجودہ مصائب کے اثر کو کہاں تک زائل کرینگے؟ اور یہ اُمیدیں گئیں،
حا تک ان نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہیں؟ کیا اُس بدنصیب سے یہ توقع
رکھنی، کہ دنیا کو جنت سمجھنے میں مرحوم داغ کا ہم خیال ہو۔ درست ہے؟

قوانین قدرت کا منشا اگر کسی خاص وقت تک اس دنیا کے باقی رکھنے
کا تھا تو ضرور تھا۔ کہ طبیعت مخلوق میں تھوڑا بہت مادۂ انہماک موجود ہوتا
اور دنیا کی قوت مقناطیسی بلا امتیاز ہر متنفس کو اپنی طرف کھینچتی حیوانی
طاقتیں بنفسانی خواہشیں جہاں انعام الٰہی ہیں وہاں بقاء نسل و تسلسل
کے واسطے بھی اُن کا وجود لازمی تھا۔ اگر اس مکروہ صورت پیرزال کے
چہرے پر دلچسپیوں کا غازہ نہ ہوتا۔ تو کوئی تھوکتا بھی نہیں۔ ایک معقول
آدمی کہتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو وجود صانع پر دلیل طلب کرتے ہیں۔ اُن کے
واسطے صرف یہ ہی صنعت ثبوت صانع ہے۔ کہ جو اُس مکروہ صورت کریہ
سیرت یقین کر رہا ہے۔ وہ بھی اس کا دلدادہ ہے!

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

مولانا جامی علیہ الرحمتہ اسی تعلق کو جزو مذہب قرار دے رہے ہیں ؎

پانچویں صدی ہجری کا ایک زبردست فلاسفر سعدیؒ جس نے عباسیہ
کی مٹی ہوئی سلطنت کا چراغ اُس وقت روشن دیکھا۔ جب اُس کی
شعاعیں تمام یورپ ایشیا اور افریقہ کو منور کئے ہوئے تھیں۔ اور دیکھتے ہی
دیکھتے ایک ایسا جھونکا آیا۔ کہ وہ روشن چراغ ٹمٹماتا ہوا ہمیشہ کیواسطے گل
ہو گیا مستعصم باللہ کی تباہی اور نیرنگی دنیا کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

تکیہ بر دنیا نہ باید کرد و دل بر وے نہاد۔

کاسمان گاہے بہ مہر ست اے برادر گہ بکین

گرگسانند از پئے مردار دنیا جنگجوے۔

اے برادر گر خردمندی چو سیمرغاں نشیں

یہ ہی محقق تباہی بغداد پر دنیا کے معنے یوں کر رہا ہے:۔

وَجَارِیَۃُ الدُّنیا نعومۃ کفہا ۔ محسنۃ لکنہا الکلبُ ذو الظفر

حیات و ممات کا فیصلہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

آں گل کہ ہنوز نو بدست آمدہ بود۔ نشگفتہ تمام باد مہرش بربود

بیچارہ بسے امید در خاطر داشت۔ امید دراز عمر کوتاہ چہ سود

جن بچوں کے ساتھ آئندہ کی تمام امیدیں وابستہ تھیں۔ جن کو دیکھ دیکھ کر ماں باپ نہال ہوتے تھے۔ ان کا حسرتناک فراق مرحوم ذوق نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

حیات و دار الحیات کے تعلقات کا شیخ نے کیا خوب نتیجہ نکالا ہے:۔

الا اے کہ بر خاک ما بگذری
بہ خاکِ عزیزاں کہ یاد آوری

کہ گر خاک شد سعدی اورا چہ غم
کہ در زندگی خاک بود است ہم

شاید مرزا صاحب کا ذکر ہے۔ کہ عمر بھر کی کمائی ایک بچی تھی جو پل پلا کر جوان ہوئی۔ شادی ٹھہری۔ جہیز تیار ہونا شروع ہوا جہیز میں ماں یہ بھی مدنظر رکھتی ہے۔ کہ ہر چیز بیٹی کی مرضی کے موافق ہو۔ تمام چیزیں جو آئندہ زندگی اور

خانہ داری میں کام آنے والی ہیں جب حیثیت فراہم کر دی جائیں چنانچہ ماں ہر تجویز میں کسی نہ کسی ذریعہ سے لڑکی کی رضامندی بھی حاصل کر لیتی ہے. خواہ براہ راست خواہ کسی ہم عمر لڑکی کی وساطت سے بجواز صرف خموشی سے۔ المختصر بدنصیب باپ کی بچی میکے سے جہیز لے کر نکلی۔ اور سسرال پہنچی۔ چند روز بیمار ہو کر میکے آئی اور دو دن میں مر گئی!

دلی میں اکثر جگہ دستور ہے وداع کے وقت باپ بھائی عزیز اقارب دلہن سے ملنے آتے ہیں۔ اور لڑکی اپنے اُن تمام عزیزوں کو جن میں چھوٹی سے بڑی ہوئی روتا اور اس گھر کو جس کی ایک ایک دیوار اور کونا اس کی بُو پہچانتا ہے۔ سنسان اور اس ماں کو جو دنوں اور راتوں گود میں لئے پھری حیران چھوڑ چھاڑ اس زمین پر سے جہاں ڈھائی تین برس کی عمر میں بنگالے کی بنائی ہوئی تھی۔ گم صم پالکی میں سوار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب مُردے کو نہلا دُھلا کر کفن دے چکتے ہیں۔ تو پس ماندگان اپنے عزیز کا آخری دیدار دیکھ کر ہمیشہ کے واسطے رخصت کرتے ہیں +

جب عورتیں لڑکی کو نہلا کر کفنا چکیں مصیبت زدہ باپ کو بُلایا کہ اُس بچی کو دیکھ جاؤ جو اب پیوند زمین ہوتی ہے +

جس لڑکی کو دیکھ دیکھ کر باپ کا چلّوؤں خون بڑھتا تھا۔ اُس کا دل کیا کٹتا ہوگا۔ یہ دیکھ کر کہ مہینہ بھر کی دلہن کفن میں لپٹی پڑی ہے +

مرزا صاحب یہ لکھ کر فرماتے ہیں ؎

اب آیا یاد اے آرامِ جاں اس نامرادی میں

کفن دینا گئے تھے بھول ہم اسباب شادی میں

شعر کے معنی یوں ہوں گے! بیٹی جہیز میں ہم نے ضرورت کی تمام چیزیں دیں۔ مگر کفن بھول گئے۔ چونکہ یہ بھی کچھ کم ضروری چیز نہ تھی۔ تم اس کی طالب ہوئیں۔ حیا مانع تھی۔ سب سے اچھا طریقہ بدنصیب باپ سے کفن وصول کرنے کا تم نے یہ سوچا!

مصائب و تکالیف کے ساتھ ہی ساتھ فطرت نے قلب انسان میں یہ مادہ بھی رکھا ہے۔ کہ رنج و آلام سے پژمردہ ہو کر راحت و اطمینان بھی محسوس کرے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی وبال ہو جاتی۔ مگر وہ بدنصیب جس کے پاس کوسوں کوئی خوشی کا سامان نہیں۔ وہ کس برتے پر زندگی بسر کر رہا ہے

جس آفت زدہ کے تین چار جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئے۔ ماں مری باپ مرا۔ ایک بیٹی رہ گئی تھی۔ وہ بھی مری۔ یہانتک کہ میاں بھی چل بسا۔ دکھڑا کیا اور پیٹ پالا۔ آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ اس سے بھی گئی اس کی عمر کیونکر گزر رہی ہے؟ اُمیدوں کا ڈھیر اس کے پاس بھی لگا ہوا ہے۔ چار برس کا ایک بچہ گود میں ہے۔ دنیا کی تمام خوشیاں اُس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خدا کی شان مرنے سے چند روز پہلے وہ بھی رخصت ہوا۔ تمام اُمیدیں ختم ہوئیں۔ اب اُس کے سامنے اگر کوئی دنیا کو جنت کہے۔ تو منہ نوچ لیگی وہ کو دنیا اور مافیہا کو اپنے ہی جیسا سمجھ رہی ہے +

متمم ابن نویرہ اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا　　　فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

"مجھ کو تو قبرستان میں ہر قبر مالک ہی کی قبر دکھائی دے رہی ہے!"

خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر   اس چمن سے گھر کو جا کر کیا کرینگے یاد ہم

حضرت علیؓ اپنی نہایت محبوب و مقدس بی بی سیدۃ النسا کے انتقال پر فرماتے ہیں:-

لکل اجتماع من خلیلین فرقۃ   وکل الذی دون الفراق قلیل
وان افتقادی فاطماً بعد احمدٍ   دلیلٌ علی ان لا یدوم خلیل

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ رسولؐ خدا کے بعد سیدہ کی موت دلیل ہے اس بات کی کہ ہر وصال کے ساتھ فراق ہے یعنی دوسرا شعر پہلے شعر کے مضمون کا نہایت مدلل ثبوت ہے +

مومن مرحوم مصائب دنیا کا حیاتِ انسانی کے ساتھ مستقل سلسلہ قرار دے رہے ہیں ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے۔
صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں +

آتش اس مضمون کو کہ ذرا ہوش سنبھالنے کی دیر تھی۔ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یوں ادا کرتے ہیں:-

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سعی فلاح و جستجو اور ان اسباب کا فراہم کرنا جو زندگی میں درکار ہیں دوسری بحث ہے۔ کلام اس میں ہے۔ کہ دنیا جنت الفردوس ہے۔ اور سوال یہ

ہے۔ کہ دُنیا دار العشرۃ ہے۔ یا دار الغرور؟

دنیا کا عالم اسباب ہونا مسلّمہ ہے۔ اور ہر وقوعہ ایک وجہ کا طالب ہے۔
یہ دو چیزیں رنج و خوشی جو زیر بحث ہیں۔ ان کا امکان بھی بلا سبب محال
ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ چھپّر پھاڑ کر کسی کے پاس خوشی کا ڈھیر لگ گیا
ہو۔ بنی نوع انسان کے تعلقات باہمی ایسے وابستہ ہیں جیسے اشعار مثنوی
یا زنجیر کی کڑیاں۔ دعویٰ یہ ہے۔ کہ کوئی شخص کوئی خوشی بلا کسی دوسرے
شخص کو نقصان دینے یا رنجیدہ کئے محسوس نہیں کر سکتا (اگرچہ بعض حالتوں
میں یہ نقصان ناگوار نہ ہو) ایک وزیر اعظم مہینہ بھر فرائض منصبی ادا کرنے
کے لئے تنخواہ کی معقول رقم پاتا ہے۔ اور یہ اسکی بڑی خوشی کا سبب ہوا
لیکن جس کی گرہ سے یہ رقم گئی۔ اُس کا نقصان ہوا یا نہیں؟ خزانہ شاہی
سے یہ رقم کم ہوئی یا نہ ہوئی؟ یہ ہی کیفیت تمام تعلقات کی ہے۔ بزاز زر نقد
لے کر کپڑا دیتا ہے۔ معمار مزدوری لے کر مکان بناتا ہے۔ اور اسی طرح ایک
ہم جنس کا نقصان دوسرے کا فائدہ سمجھا گیا ہے۔ تجار شب و روز دست
بدعا ہیں۔ کہ امساک بارش بنی اسرائیل کا قحط دکھا دے۔ غیر تجار کہہ رہے
ہیں۔ خدا کرے من بھر کے گیہوں ہو جائیں۔ فریقین میں سے ایک خوش
اور دوسرا رنجیدہ ضرور ہوگا!

یہ اُن کا حال ہے جن کے ذرائع معاش مختلف ہیں۔ اب اُنکو دیکھو
جو حریف یعنی ہم پیشہ ہیں۔ دو پٹوے برابر دکان میں بیٹھے ہیں ہنس
بھی رہے ہیں۔ بول بھی رہے ہیں۔ اتفاق سے ایک شخص ڈورا ڈلوانے

آیا اور ایک سے چکانے لگا۔ فطرت انسانی شاہد ہے۔ کہ دوسرا منتظر ہے۔ کسی طرح اُس کے ہاں سے اُکھڑے اور میں جماؤں ٭

اہل صنعت و حرفت سے آگے بڑھ کر تعلیم یافتہ گروہ کو دیکھو۔ صاحب ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پچاس روپیہ کی ایک جگہ خالی ہے سیکڑوں اُمیدوار ہیں۔ اور ہر ایک اپنی کامیابی کا خواستگار۔ ان میں ایک کی کامیابی باقیوں کی کس قدر افسردگی کا باعث ہو گی۔ بیرسٹر۔ وکیل۔ مختار کسی مقدمہ کا فقط شروع ہونا تھا۔ پہلے اس بات کے خواہاں رہے۔ کہ ایک فریق کی طرف سے ہم بھی پیروی کریں۔ اس کے بعد کامیابی کے۔ اب یہ کامیابی فریق مخالف پر کیا اثر کرے گی؟

حکیم۔ ڈاکٹر۔ وید زیادہ تر اس خیال سے تندرست ہیں۔ کہ لوگ بیمار ہوں گے۔ گورکنوں کی زندگی صرف اس پر ہے۔ کہ لوگ مریں گے ٭

کہا جا سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں انسان ایسی خوشی بھی محسوس کرتا ہے جس کا ہیچ وہ تعلق بظاہر کسی متنفس سے وابستہ نہیں۔ مثلاً بیٹے کی پیدائش۔ مایوس مریض کا جانبر ہونا۔ کامیابی امتحان وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسکا جواب کیا ہو گا۔ کہ جہاں تعلقات انسانی بہت سے دوست پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں وہاں چند دشمن بھی اس کی بدولت میسر ہو جاتے ہیں؟ اس بات کا یقین خاص صورتوں میں ہو گا۔ کہ تمام تعلقات میں ایک شخص کا کوئی بھی بدخواہ نہیں۔ اگر بہزار تجسس دو چار اللہ کے بندے ایسے نکل بھی آئے۔ تو ان سے زیادہ ایسے ملیں گے۔ جن کی تمام عمر بغض للہی میں گزر گئی۔ ذرا کسی کو خوش دیکھا اور انگاروں

پر بوٹ گئے۔ ایک عورت جو لڑکا پیدا ہونے سے نہال نہال ہے۔ چھٹی کی تیاری دھوم دھام سے کر رہی ہے۔ بظاہر اُس نے کسی ہم جنس کی خوشی میں ساجھا نہیں لڑایا۔ مگر نند کا دل کیا کہتا ہوگا۔ جس کے ہاں مفلسی میں اوپر تلے سات بیٹیاں ہو گئیں؟ جیٹھانی سے پوچھو جس کے ہاں ایک چھوڑ پانچ چھ لڑکے ہوئے اور سب پل پلا کر آٹھ آٹھ دس دس برس کے رخصت ہوئے۔

بسا اوقات یہ دیکھا۔ کہ صرف ایک خوشی کے واسطے آدمی نے سخت سے سخت مصیبت اُٹھائی۔ مگر وقت آیا تو خوشی بھی رنج سے بدل گئی +

ایک شخص جس کی تمام عمر بیٹے کے ارمان میں گزری۔ بیسیوں جتن سیکڑوں کوششیں۔ ہزاروں روپے۔ دوا درمن غرض سب ہی کچھ کیا۔ مگر بچہ کیسا کبھی کچا بھی نصیب نہ ہوا۔ خدا خدا کر کے بڑھاپے میں آ کر اُمید ہوئی۔ ایک ایک دن گن کر مدت پوری کی۔ وضع حمل ہوا۔ تھوڑی دیر میں ادھر بچہ اور اُدھر زچہ دونوں ختم ہوئے +

دنیا کو دار العشرۃ ثابت کرنا تو در کنار دار الغرور نہ ثابت ہونے دینا بھی بہت مشکل ہے۔ اگر یہ دار ناپائدار بہشت ہے۔ تو اس کا جزو اعظم انفراغ کلی ہوگا جو قطعی میسّر نہیں۔ یہاں اُس حکیم کے مقولہ کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا ہے۔ کہ کوئی شخص اپنی حالت دوسرے سے تبدیل کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ہر دوسرے شخص کی حالت میں کوئی نہ کوئی سُقم۔ کچھ نہ کچھ عیب تھوڑا بہت القصّہ ایسا موجود ہے جو خود اُس میں نہیں +

یہ صنعت ہے کہ باوجود ان تمام نقائص کے ایسی دلبستگی کے سامان

بھی موجود ہیں۔ جو طبیعت کو اُکتا نے نہیں دیتے۔ اور یہ فطرت ہے کہ ان تکلیفوں پر بھی آدمی اس کا گرویدہ بنا ہُوا ہے ؂

سیکرڈ آفر گوڈ میں ایک جگہ سینکا کا خیال اس طرح ظاہر ہوتا ہے:۔ "جکو تم خوشحال خیال کرتے ہو۔ اگر تم ان کی بیرونی حالت پر نہیں بلکہ اندرونی حالت پر نظر ڈالو۔ تو وہ کم بخت و ذلیل و خوار ہیں۔ وہ ایسی دیواروں کی مانند ہیں۔ جو اوپر سے اچھی طرح آراستہ ہیں"؂

ایک جگہ وہ کہتا ہے :" ہپوکریسیٹر نے مریضوں کو شفا دی اور مر گیا جالڈنر نے پیشین گوئیاں کیں اور مر گیا۔ الگزنڈر پومیری نے ہزاروں کو ہلاک کیا اور مر گئے۔ ایک لائس نے ڈموکریٹیز اور دوسرے نے سوکریٹیز کو مار ڈالا۔ اگسٹس اُس کی بیوی بیٹی اور تمام اولاد و آباؤ اجداد مر گئے۔ اور ولسپیسن۔ اُس کے اہل دربار۔ ...... سب کو موت لے گئی"؂

اسی سلسلہ میں وہ کہتا ہے:" جب تک تو زندہ ہے۔ موت تیرے سر پر کھڑی ہے۔ اور تیرے اختیار میں ہے۔ کہ تو نیک بن"۔ بعض جگہ اس کے خیالات بالکل اس کے مطابق ہو گئے ہیں۔ ؎

نہ غم آورد نقصانے نہ شادی داد سامانے۔
بہ پیشِ ہمتِ ما ہر کہ آمد بود مہمانے؂

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ کیا معقول بات کہہ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ "سوادِ چشم و سویدائے قلب یہ دو چیزیں انعامات الٰہی ہیں۔" آنکھ کی کیفیت یہ ہے۔ کہ اگر پتلی کے مقابل ایک اُنگلی کھڑی کر دو تو آنکھ کا کام

ختم ہو گیا۔ دل کے سامنے تمام دنیا کی محبت آموجود ہو۔ تو دل اپنا کام کس طرح انجام دیگا؟

ایک بات اور بھی قابل بیان ہے۔ تکلیف خواہ کتنی ہی کم مقدار کیوں نہ ہو۔ اور رنج خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ بڑے سے بڑا آرام اور اچھی سے اچھی خوشی اُس کو قطعی زائل نہ کر دے گی۔ لیکن خوشی چاہے کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو۔ چھوٹا سا رنج اُس کو کرکرا کر دیگا۔ دردِ سر کی معمولی شکایت چاروں طرف سونے کا ڈھیر لگا دینے سے بھی رفع نہ ہوگی۔ لیکن یہی معمولی شکایت جواہرات کی خوشی کو بھی پھیکا کر دیگی۔ ایک لگن میں پانی بھر کر ماشہ بھر رنگ ڈال دینے سے گو تمام پانی رنگدار نہ ہو مگر پانی کا رنگ ضرور تبدیل ہو جائیگا۔ تمام دنیا چھان مارو۔ کوئی فرد بشر ایسا نہ ملیگا۔ جو حوادثات سے مطمئن ہو۔ عمر گراں بہا کا بیشتر حصہ رنج و آلام میں گزرا اور بمشکل تمام چند گھڑیاں ایسی ملیں۔ کہ قلب نے بلا کسی رنج و خیال کے خالص خوشی محسوس کی۔ اسی مضمون کو سوکریٹیز نے اس طرح ادا کیا کہ اگر تمام دنیا کی خوشی اور رنج ایک جگہ جمع کئے جائیں۔ اور پھر تمام بنی آدم پر مساوی تقسیم ہوں۔ تو ہر شخص تقسیم شدہ رنج و راحت کو مصیبت اور حالتِ سابقہ کو نعمت سمجھے گا +

اب حالتِ انسانی کو تین حصوں میں تقسیم کرو۔ مسرت غیر مسرت اور عشرت + جس طرح رفتارِ زمانہ نے بڑے بڑے سورما اور کج رفتار اپنے ڈھرے پر ڈال لئے۔ اسی طرح مصیبت بھی رفتہ رفتہ عادت میں داخل

ہوجاتی ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔

مصیبت یا عسرت میں استقلال چنداں مشکل نہیں۔ مگر غیر عسرت میں قناعت اور عشرت میں شکر ذرا مشکل کام ہے۔ غزالی کی رائے ہے۔ کہ مصیبت میں صبر مومن کا کام ہے اور غیر مصیبت میں شکر صدیق کا!
کرسچینیٹی ہندوازم اور اسلام صبر کو نہایت اچھی صورت میں آدمی کے سامنے پیش کر رہے ہیں لیکن غزالی علیہ الرحمۃ کے الفاظ شکر کو صبر پر اس وجہ سے ترجیح دے رہے ہیں۔ کہ اہل مذہب جو اپنا بندہ ہونا تسلیم کر رہے ہیں۔ اُن کا یقین یہ ہے۔ کہ انسان سے ہر حال میں شکر کی توقع کی گئی ہے۔ مگر تجربہ یہ کہتا ہے۔ کہ کوئی شخص خواہ صاحب مذہب ہو یا لامذہب اس تھیوری پر کاربند نہیں۔ اب وہ جگہ جہاں کوئی نہ ہو۔ دارالعشرۃ ہوسکتی ہے
ایک سرسری نظر ان دلبستگیوں اور دلچسپیوں پر بھی ڈالنی چاہئے جو دوران زندگی میں نہایت خوشگوار ہیں۔ اور جن پر دارالعشرۃ کا تمام دارومدار ہے۔

خوشیوں میں خوشیاں دو بہت بڑی خوشیاں مال اور اولاد ہیں۔ دولتمند کو بیٹے اگر سونے کی کان ہیں۔ تو مفلس کو بیٹیاں وبال جان۔ ذوق مرحوم کہتے ہیں ؎

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی

دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے،

اولاد اور اولاد میں بھی بیٹے بہت بڑی نعمت ہیں۔ لیکن یہی نعمت بعض دفعہ ایسی آفت ہو جاتی ہے۔ کہ چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار اگر وقتِ ولادت مار زایند۔
ازاں بہتر بنزدیک خردمند کہ فرزندانِ ناہنجار زایند

رہا تموّل جس کا پیش خیمہ غرور و نخوت۔ سنگ دلی و محسن کشی ہیں۔ اس کی ایک ادنیٰ صفت یہ ہے۔ کہ ہمدردی جو شیوۂ انسانیت ہے اسی کی بدولت رخصت ہو جاتی ہے ؛

الخلق عیال اللہ کی تلقین تقریباً ہر مذہب نے کی۔ مگر دولتمندی تو پہلی آفت ہے۔ جس کی بدولت یہ اصول ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اہل مذہب کے واسطے اس سے بڑی مصیبت اَور کیا ہوگی۔ کہ دائرہ مذہب سے باہر نکل آئے ؟ تموّل میں استقامت مشکل سہی۔ مگر محال نہیں۔ اور اگر محال ہے۔ تو یہ دلیل اس بات کی ہے۔ کہ اُس مذہب کے اصول بالکل لچر ہیں۔ المختصر تموّل جو سب سے زیادہ محبوب و مرغوب چیز ہے۔ وہ بھی اتنے بڑے سُقم سے آلودہ ہے۔ ایسے بھی ہوں گے۔ کہ دولتمندی میں احکام مذہب پر قایم رہے۔ مگر ایسے بہت ہوں گے۔ کہ دولت کی صورت دیکھتے ہی فنا فی العشرت ہو گئے ؛

ہارون جس وقت دفات سے واپس آرہا تھا۔ رستہ میں بہلول سے

ملاقات ہوئی۔ ہارون نصیحت کا طالب ہوا۔ بہت بڑی گفتگو کے بعد بہلول نے کہا:۔

"ہارون! مال و جمال کسوٹی ہیں۔ ذرا ہشیار رہنا!"

تجربہ بتاتا ہے کہ مالدار خواہ تن تنہا خواہ عیال دار مطمئن ہرگز نہیں ؏

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

ایک نعمت مرد کے واسطے عورت اور عورت کے واسطے مرد ہے!

جیسا کہ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔ ؎

زنِ نیک فرمانبرد پارسا۔
کند مردِ درویش را بادشاہ+

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

زن دوست شو دولے زمانے۔
تا جز تو نیافت مہربانے۔

خود شیخ کے بیان نے اس نعمت کو مشروط کر دیا۔ اور یہ اصول کلی نہ رہا+

اس نعمت کی قدر و منزلت اُن مردوں سے پوچھنی چاہئے جن پر عورتوں کے ہاتھوں سخت سخت مصیبتیں گزر رہی ہیں+

فرقہ اناث کا اطمینان و آرام اُن کے اس مقولہ سے معلوم ہوتا ہے:۔

"اونٹی روئے سٹپوتی روئے رات کی بیاہی روئے"

• الغرض یہ تمام گلہائے رنگیں کانٹوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ صورت ظاہری پر فریفتہ ہوکر خاصیت کو نظر انداز کر دیں ٭

• اعتراف انعام میں کلام نہیں۔ مگر جہاں اس کا انکار محسن کشی ہے وہاں تکلیف کو راحت بتانا بھی بوالہوسی ہے ٭

جعفر وزیر ہارون کی موت۔ خاندان برمکی کا انقلاب۔ تاریخ بغداد میں دنیا کے معنی یوں کر رہا ہے جعفر کی ماں یعنی وہ عورت جس نے ایک عید کو چار سو خلعت گراں بہا تقسیم کئے۔ دوسری عید کو ثابت کپڑا نہ تھا!

کیسا درد انگیز وقت ہوگا۔ جب پانی پت کی لڑائی کے بعد ابراہیم کی ماں ہمایوں کے روبرو آئی۔ اُس کی ظاہری ہیئت بتا رہی تھی۔ کہ اس محلوں کی بیٹھنے والی نے زمین پر بھی مشکل سے پاؤں دھرا ہوگا شہزادے کے سامنے آکر جس وقت کھڑی ہوئی۔ تمام جسم کانپ رہا تھا۔ بالآخر اس نے ہاتھ نکال کر کوہ نور ہیرا جو الماس کی ڈبیا میں تھا ہمایوں کو دیا اور کہا۔

"شہزادے یہ ہمارے پاس امانت تھی۔ اب چونکہ اقبال تیرے ساتھ ہے سلطنت تیری حکومت تیری۔ یہ امانت بھی لے"

جان کا وہ واقعہ بھی قابلِ غور ہے۔ جب اُس نے بھتیجے کی آنکھیں نکالنے کا ارادہ کیا اُدھر کی گریہ وزاری ہیوبرٹ ڈی برگ کی منت و سماجت سنگدل جان کی شقاوت۔ اور میلپک کی مدد سے بھتیجے کو قتل کرنا عبرتناک

سین ہے۔ڈیوک اوف گلوسیسٹر کا کمسن شہزادوں کے قتل پر آمادہ ہونا اور ٹامٹرل کا ڈائیلن اور فورسٹ کو ترغیب دینا۔ ان بیرحموں کا اس کمرے میں داخل ہونا کیسا دردناک سماں ہوگا۔ تاریخ انگلستان میں لکھا ہے۔ جس وقت یہ سفاک داخل ہوئے دونوں بچے ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے رخسار پر رخسار رکھے سوتے تھے۔ ظالموں نے ایک ایک کپڑا اُڑھا کر صاف کر دیا ؛

اگر یہ تمام موجودات طبقۂ ادنیٰ واعلیٰ لہٰذا نیز انسانی سے متعلق ہیں۔ اور بیش بہا نا العام سمجھے جا سکتے ہیں۔ تو اس کا کیا جواب ہوگا۔ کہ بقاء حیات واجزاء تسلسل سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اگر مقاصد قدرت میں استقرار دُنیا بھی شامل ہے۔ تو کوئی عطا نعمت نہ رہی۔ جب زندگی بنفسہٖ نعمت نہیں۔ تو بقاء زندگی کے اسباب کس اصول پر نعمت ہونگے؟ ہوا نہ ہوتی نہ سہی۔ پانی نہ ہوتا بلا سے۔ آدمی مرجاتے اچھا ہوتا۔ آنکھیں اگر نعمت ہیں تو حافظ جی کس جرم میں اندھے ہوگئے؟ اعضاء جسمانی اگر نعمتیں ہیں۔ تو شیکسپئیر نے اس نعمت کا اعتراف کیا بُرا کیا۔ کہ یہی اعضاء بڑھاپے میں وبالِ جان ہوجاتے ہیں؟

اگر قویٰ نعمت ہیں۔ تو ان کا انحطاط مصیبت ؛

ان تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد ایک صحیح الدماغ آدمی دنیا کے معنی یوں کریگا:۔

کُن فی الدُّنیا کانک غریبٌ او عابرُ سبیلٍ

ایک سرسبز و شاداب باغیچہ ہے۔ خوشنما پھول چاروں طرف کھلے ہوئے ہیں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ وسط چمن میں لہریں لے رہا ہے۔ جا بجا فوارے چھٹ رہے ہیں ننھی ننھی بوندیں سبزۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے دے کر جگا رہی ہیں۔ سرو اور بار آور درختوں کی قطاریں دُور تک چلی گئی ہیں۔ صبح کا سہانا سماں۔ طائران خوش الحان کی چہکار نسیم کی اٹکھیلیاں بلبل کی چہک۔ پھولوں کی مہک۔ مٹی کی لہک اُس خطۂ زمین کو جنت الفردوس بنا رہی ہے، ایک بھولا بھٹکا تھکا ہارا مسافر کسی طرف سے آنکلا سو دیکھتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ رستے کی کلفت منزل کی پریشانی۔ مسافت کی تکالیف سب بھول گیا، مصیبت کا مارا دم لینے کو بیٹھا۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے تو میوہ دار درخت جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں، اُٹھا پیٹ بھر کر میوے کھائے۔ ڈٹ کر پانی پیا۔ بیوی کے لئے ٹہنی توڑی۔ بچوں کے لئے پھول چنے۔ لہلہاتا ہوا سبزہ آنکھوں میں کھب رہا تھا۔ بے اختیار ہو کر لیٹ گیا، لیٹنا تھا۔ کہ نیند آگئی، آنکھ کھلی تو آفتاب نصف النہار پر تھا۔ رنگا رنگ کے پھول مرجھا چکے تھے چہکار کے بدلے شیروں کی دہاڑ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ کان میں آرہی تھی۔ نہر کو جھانک کر دیکھا۔ تو صاف و شفاف پانی کے بجائے کیچڑ کے ڈھیر لگے ہوئے۔ بادِ سموم کی لپٹیں دوزخ کا مزہ دکھا رہی تھیں۔ گھبرا کر اُٹھا، مگر گرا سنبھلا اور پھر اُٹھا۔ سہموں کے مارے جان نکلی جا رہی تھی یہ کہتا ہوا سب طرف لپکا ؎

زنہار از دورِ گیتی وانقلابِ روزگار

درخیال کس نہ گشتے کانچناں گردد چنیں ۔ (سعدیؒ)

مگر جدھر جاتا تھا سنگین دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں جرماں نصیب مسافر ایک مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک دروازہ دکھائی دیا۔ شکر کرتا ہوا دوڑا۔ اور یہ پڑھتا ہوا باہر آیا ؎

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد۔
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست ۔ (حافظؒ)

بڑے بڑے تاجدار فارغ البال اس پیر زال کے ہاتھوں ایسے ذلیل وخوار ہوئے۔ زندہ تو زندہ مُردے کی بھی وہ مٹی پلید ہوئی۔ کہ خدا دشمن کی نہ کرے۔ جن کی زندگی میں سونے اور چاندی کی ریل پیل تھی مرتے وقت چراغ میں تیل بھی میسر نہ ہُوا۔ جن جن گھروں میں آدھی آدھی رات تک چہل پہل رہتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھنڈار ہو گئے۔ جہاں دن دن بھر میلے لگے رہتے تھے۔ آج سناٹا چھایا ہوا ہے۔ علوم وفنون کے ماہر۔ تحریر کے دھنی تقریر کے ساحر۔ بدنصیب و شادکام۔ سنگدل و گل اندام موت نے ایک کو نہ چھوڑا۔ کیسے کیسے کڑیل جوان آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ محلوں کے رہنے والے آناً فاناً ہزاروں من مٹی کے نیچے جا پہنچے۔ گھروں کی گھر والیاں۔ سروں کے وارث۔ کلیجے کے ٹکڑے نور کے پتلے۔ باپو ماتیاں۔ بہن اور ماں جائیاں بھلاں باپوں کی جان کہاں گئے؟ جنگل بیابان۔ معمولی گورستان۔ ایک ہُو کا میدان۔ کیلی کا کھٹکا نہ پتے کا کھڑکا شام کا جھٹ پٹلا وقت۔ آدمی نہ آدم زاد۔ سیجوں پر سونے والے اندھیرے

گھُپ میں پڑے ہیں ؛

ہائے نشۂ موت کے متوالو! اچھے سوئے کہ کروٹ تک لینی قسم ہوگئی خوش نصیب تھے تم کہ حسرت و ارمان کے خزانے ساتھ لے گئے۔ کنگال آئے اور مالا مال ہو کر گئے ؛

اے دنیا کا دم بھرنے والو۔ اور جنگل کے رہنے والو! بولو بولو! بولو۔ بولو! دیکھو یہ دنیا نہا دھو کر کیسی نکلی۔ اور اس نے کیا روپ بدلا! تم مٹ گئے اور یہ بڑھیا ہی چوتھی کی دلہن ہے۔ اُٹھو عدم آباد کے مسافرو اُٹھو اس کا گھونگٹ کھولو۔ اس کو منہ دکھائی دو۔ دیکھو یہ عروس اپنے ہاتھوں کے گجرے تمہاری قبروں پر چڑھا رہی ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو۔ اس کے ناز و انداز۔ اس کی وضع طرح۔ اس کی چال ڈھال ستم ڈھا رہی ہے۔ اس کی رفتار کلیجہ مسل رہی ہے۔ اور اس کی نگاہیں کلیجے کے پار ہو رہی ہیں سُنو سُنو اس کے چہچہے کیا غضب کر رہے ہیں! دیکھو دیکھو یہ دبکی دبکائی سمٹی سمٹائی۔ سُکڑی سُکڑائی کیا پٹر پٹر بول رہی ہے۔ بڑے بڑے عابد و زاہد اس کا منہ تک رہے ہیں۔ اور اچھے اچھے محتاط اس کی ایک نظر کے مشتاق کھڑے ہیں۔ اور یہ سب کا دل لبھا رہی ہے ؛

یاران طریقت تمہاری رحلت عبرت کی جگہ تھی۔ مگر اسکی دلربائیوں نے سب کچھ بھلا دیا۔ تمہاری یاد سے بھی دل کڑھتا۔ مگر یہ روشن چاند چمکتے ہوئے تارے۔ یہ نسیم صبح۔ یہ کھلے ہوئے پھول۔ یہ دن۔ یہ رات۔ یہ جاڑا۔ یہ برسات۔ یہ ربیع و خریف ہر چیز تمہاری حریف نکلی۔ تمہاری

جُدائی سے کلیجہ بہت تلملایا۔ مگر ترقی روزگار۔ حصولِ دولت جلبِ منفعت سب نے مِل مِلاکر تمہارا فراق طاق میں رکھوادیا +

اے آنکھ کے تارو۔ اے پیاروں کے پیارو! اب تو ہم کو تمہارے خاک کے ڈھیر پر آنے کی بھی فرصت نہیں۔ تمہاری محبت آنکھوں دیکھے کی تھی۔ تمہارے مُنہ موڑنے کی دیر تھی۔ ہم بالکل ہی چھوڑ بیٹھے۔ دو چار روز شوقِ ملاقات وحسرتِ دیدار نے تڑپایا۔ مگر اب تو ہم تمہارے خیال کے بھی رَوادار نہیں +

جنّت دنیا کے بسنے والو دیکھو۔ زندوں کی محبّت نے مُردوں کی یاد دل سے بُھلادی۔ آنکھ بند ہونے کی دیر ہے۔ اسی طرح یہ زندہ کبھی بھول کر بھی تم کو یاد نہ کریں گے +

منہ دل بریں گنبدِ زرنگار۔

ز سعدی ہمیں یک سخن یاد دار +

ایک مظلوم بیوی کا خط

اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ انتیسویں دن ڈھائی سو روپے ہاتھ میں آتے تھے۔ ایک یہ وقت ہے۔ کہ آج پانچ مہینے بعد احمد کی ساس پچاس روپیہ لے کر آئیں۔ عیش و آرام تو تمام ہو ہی چکا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ تمہاری زندگی ہی میں فاقوں کی بھی نوبت پہنچ گئی۔ چار بچے۔ ایک مرکم[2] دو بکریاں۔ ایک بیگم[1] آٹھ دم اور دس روپیہ مہینہ۔ ی کس کیا بٹا؟ کچا ساتھ۔ پردیس کی بات۔ شہر کا خرچ۔ کال کا زمانہ۔ بھیڑ کی لات گھٹنوں تک۔ چوری کروں یا بھیک مانگوں؟ میں بیچاری عورت ذات۔ بیسوں بچاؤں۔ پالوں۔ کماؤں۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔ میرے بل پر یہ گھر کب تک چلیگا۔ اور یہ پہاڑ سی عمر کس کے کاٹے کٹے گی؟ ایسا نصیبہ پھوٹا کہ پان زردہ عطر تیل سب چھوٹا۔ ایک روکھی روٹی رہ گئی تھی۔ اُس کے بھی لالے پڑ گئے۔ خدا سے ڈرو اور مرنے کو مرنا سمجھو۔ گھوڑوں کو ڈھائی ڈھائی تین تین سیر دانہ۔ اور بچوں کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو۔ تمہارے پاس بوریوں کی بوریاں بھری ہوں۔ اور بچے ایک ایک مٹھی چنوں کو ترسیں۔

ممانی جان[3] (اللہ اُن کو جنت نصیب کرے) آج کو زندہ ہوتیں۔ تو

---

[1] چھوکری۔ [2] دوا۔ [3] ساس۔

تمہاری مجال تھی۔ کہ سوکن لاتے اور میری ہی چھاتی پر مونگ دلواتے؟ ایک کا یہ سہاگ۔ کہ روپیہ پیسہ۔ عیش عشرت۔ کپڑا لتا۔ گہنا پاتا۔ سب موجود۔ دوسری کو یہ آگ لگی۔ کہ کس کا چین اور کہاں کا آرام۔ کیسا گہنا اور کس کا کپڑا تین تین وقت کے کڑاکے + ایک کے صندوقچے میں بھری ہوئی عطر کی شیشیاں ہوں۔ اور دوسری کے چراغ میں جلانے کا تیل بھی نہ ہو۔ غضب خدا کا برس کا برس دن۔ تہوار کا روزا اور تحصیلدار کی اولاد ایسی ناشاد و نامراد۔ کہ اوڑھنی کی گھنگنیاں بھی میسر نہ ہوں + چھ برس کی بچی ابھی تقدیر لے کر آئی۔ نہ دھیلے کی مہندی۔ نہ دمڑی کا رنگ۔ نہ ڈھنگ کا چیتھڑا۔ نہ پاؤں میں لیتڑا۔ تم تو ایسے پلٹے گویا جان پہچان ہی نہ تھی۔ خدا کی شان۔ یا وہ آن بان کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھے۔ یا یہ بے غیرتی کہ کان پر جوں بھی نہ چلے +

ادھر حمیدہ ماشاءاللہ چار برس میں کہیں پہنچ گئی۔ ادھر سعیدہ برابر اُٹھتی چلی آرہی ہے۔ یہ پتھر میرے سر کائے تو سرکتے نہیں۔ جیدری ہر گھڑی آنکھ بند کرنے کی دیر ہے۔ کیسے برس اور مہینے۔ لڑکی کی بیل اور ککڑی کی بیل گھنٹوں میں بڑھتی ہے۔ یہ چار پہاڑ اور میں اکیلی۔ خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو +

جیسی میری مٹی پلید ہوئی۔ خدا نہ کرے۔ کہ دشمن کی بھی ہو۔ جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں۔ چین اور آرام تو الگ رہا پلک سے پلک جھپکانی حرام ہے۔ پلنگ پر لیٹی اور جھگڑا بندھے۔ جدھر دیکھتی ہوں اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے۔ مٹکے میں آٹا نہیں۔ بقچی میں کپڑا

نصیب۔ پاؤں میں جوتی نہیں۔ سر پہ دوپٹہ نہیں۔ خانہ داری کی مصیبت۔ قرضداری کا فکو ہر وقت کی کوفت۔ آئے دن کی بیماری۔ بزاری کا تقاضا۔ کبیرن کی فضیحتی۔ خدا کی قسم جان اجیرن ہو گئی۔ سوت نے مجھے موت کا مزہ چکھا دیا۔ اب تو یہ دعا ہے۔ کہ خدا مجھ کو اُٹھا لے۔ تم بیٹھے عیش کرنا۔ نہ میں ہوں گی نہ کھٹکو نگی۔ بیس بائیس برس دُنیا کی بہار دیکھ لی۔ خدا گواہ ہے۔ اب زندگی سے بیزار ہوں۔ تم نے اپنی زندگی سنواری اور میری برباد کی۔ اپنا گھر بنایا۔ اور میرا اُجاڑا۔ خوش رہو آباد رہو۔

یہ جلے کا جاڑا۔ کہ دانت سے دانت بجیں۔ اور گھر بھر میں کسی کے بدن پر نئی روئی کا کپڑا نہ ہو۔ جو شخص ماشاء اللہ تین سو روپیہ مہینہ کمائے۔ اُس کے بچے لحاف کو ترسیں۔ ذرا انصاف کرو۔ دونوں لڑکیاں ایک پُرانے کمبل میں سردی بسر کریں۔ کیوں ایسی بیدادی پر کمر باندھی ہے؟ صنوبر[1] کی ماماؤں تک کی بیک کی رضائیاں۔ اور حمیدہ سعیدہ سوں سوں کرتی پھریں! گنہگار ہوں تو میں۔ خطاوار ہوں تو میں۔ بُری ہوں تو میں۔ بدصورت ہوں تو میں۔ بیزار ہو تو مجھ سے ہو۔ بچے کمائی کے حقدار کیوں نہ رہے؟ کیا خدا کی شان ہے۔ حمید[2] بھر بھر لٹیاں دودھ کی لنڈھائے۔ چار چار روپے کے کھلونے لائے اور توڑے اور سعیدہ کو اُبالی دال بھی میسر نہ ہو!

جن ہاتھوں سے سیکڑوں ہزاروں روپے اُٹھائے۔ آج وہ ہاتھ ایک ایک پیسے کو محتاج ہیں۔ تمہاری کمائی میں ہمارا استحقاق نہ رہا۔ کہ پائی کا

[1] دوسری بیوی۔ [2] صنوبر کا لڑکا۔

پیسہ تو میسر ہوتا جس بچی کے ذرا سے بخار میں میں نے چار چار بکرے مارے، آج وہ دو آنوں کے واسطے صبح سے شام تک آنکھوں کا تیل نکالتی ہے، جب ایک بیل پوری ہوتی ہے، مجھ کو کیا معلوم تھا کہ میرے معصوم یہ دن دیکھینگے اور قسمت یہ مصیبت دکھائے گی؟ بائیس برس پکی پکائی کھا کر آج چار بجے سے چکی کے آگے بیٹھنا پڑتا ہے، ہائے تقدیر۔ بھرے گھر سے نکل کر فقیر ہو گئی!

جو حالت میری ہوئی۔ الٰہی کسی کی یہ گت نہ ہو، فقیروں سے بدتر گھر، مُردوں کی سی صورتیں، دالان میں اُپلے۔ سائبان میں مٹکے۔ بچے ننگا چارپائی پر جھلنگا، چبوترے پر منوں خاک، صحن میں سیروں راکھ۔ دری نہ رضائی، بچھونا نہ چارپائی۔ برتن ہیں وہ لوہا، تکیے ہیں وہ چوہا۔ ساری بہار چار پیسے کی ہے۔ وہی میں ہوں کہ نگن کی مہم کا بیگم بیگم کہتے مُنہ خشک ہوتا تھا۔ یا آج سڑی سی بھنگن جو جو مُنہ میں آتا ہے سنا جاتی ہے۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

لاکھ سور ما ہو۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، حمیدہ کو دیکھ دیکھ کر روح فنا ہوئی جاتی ہے۔ فاقوں کی ماری مصیبت زدہ دُکھیاری۔ دبلی دبائی کا وہ ڈیل ڈول نکلا ہے۔ کہ الٰہی توبہ، اس کا گھر بسانا میرا کام ہے؟ ایسی تقدیر پھوٹی کہ دادا دادی۔ نانا نانی چچا چچی۔ ماموں مُمانی۔ بڑے اور چھوٹے مرد اور عورت ایک سرے سے سب ہی کو موت آ گئی، مفلس خوشحال۔ مالدار کنگال کوئی بھی نہ رہا۔ ددھیال اور ننھیال دونوں ہی کا صفایا ہو گیا۔ اچھے اور بُرے۔ امیر اور غریب حمیدہ بدنصیب سے پہلے ہی چل بسے۔ سارے کا

سارا خاندان مصیبت زدہ بچّی کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کرکے رخصت ہوگیا۔ پچاس آدمی کے کنبہ میں ایک چھوٹی دادی اور ایک خالہ فاطمہ دو دم رہ گئے تھے۔ رجب میں اُن کا بھی خاتمہ ہوگیا +

گھر کی ایسی خاک اُڑ رہی ہے۔ کہ الٰہی تیری پناہ! موئے فقیروں کے ٹھیروں میں بھی ڈھنگ کا بستر ہوگا مگر مجھ کو وہ بھی نصیب نہیں۔ اس گھر سے تو تحصیلدار کی بیٹی کو دو آنے کا بیلدار بھی لے جائے۔ تو اُسکا احسان ہے۔ آخر حمیدہ کا نکاح کرنا ہے یا نہیں؟ امیری نہ ہو نہ سہی۔ گہنا نہ ہو بلا سے عیش نہ ہو خیر۔ نوکر بیکار۔ اچھا بُرا خوش مزاج۔ اکل کھرا غریب۔ امیر جیسا بھی حمیدہ کی تقدیر۔ مگر کسی طرح اس کے دو بول ہوجائیں +

تمہاری بیوی تم کو مبارک! میں اپنی فقیری میں بھی خوش ہوں۔ تم کو خدا نے نئی دولت دی۔ نئی بیوی دی۔ مال دیا۔ جائداد دی۔ ماما۔ نوکر چاکر۔ بگھی گھوڑا۔ تم جتنا اچھلو سب تھوڑا۔ فقیرنی بھیک منگی جتنا اترائے سب ٹھیک سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اُبل پڑیگی۔ سدا کے ٹھلاتے ہمیشہ مانگی بھیک عمر بھر کی مزدوری۔ رات دن میں صدریاں خیرات پر گزر۔ زکوٰۃ پر گھر۔ لیترا جوتی۔ چیتھڑا موزہ۔ آگیا تو روزی نہیں روزہ پہنتی رہی لیریاں بیتی رہی ٹاٹ جنم نہ دیکھا بوریا۔ سپنے آئی کھاٹ۔ گھر بھر فقیر۔ کنبہ بھر محتاج۔ آج ہی منوبر کو یہ دن لگے۔ ہاتھوں میں ٹھوس کڑے۔ ماتھے پہ جھومر۔ گھر میں مامائیں ڈیوڑھی چھوکرے۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ مجھ کو نہ فرصت تھی۔ نہ ضرورت تھی۔ نہ جب تھی نہ اب ہے۔ دکھاوا نہ کرسکتی ہوں۔ نہ کرونگی۔ کہ گھر میں سیکڑوں مہمان۔ اپنے

پرائے جان پہچان اور انجان۔ اور گھنٹوں میٹھی میاں کے پیر دباؤں۔ اُنکو تو دل ہی گھر کرنا تھا۔ ایسی گھسی کہ سب سے تڑا میاں کو کھونٹے سے باندھ لیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ سوکن میرا گھر چھیننے کی فکر کر رہی ہے۔ اور یہ رنڈالی ایک دن گھروالی ہو جائے گی؟ مجھ کو اللہ رکھے اپنے بچوں ہی سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ تمہاری خدمت کرتی۔ ہاتھ جوڑ کر آتی تو گھنٹوں پاؤں دباتی لانے والی مر گئیں۔ مہینوں آئی ہیں۔ اور دونوں مِنّتیں کی ہیں۔ وہ ہوتیں تو رونا ہی کیا تھا؟ اپنا پیٹ کاٹتیں اور بچوں کا پیٹ پالتیں۔ لائے کی لاج تھی۔ کٹے کا نباہ کرتیں۔ گیہوں نہیں باجرا۔ اور باجرا نہیں بجھڑ۔ سالن نہیں شوربا۔ اور شوربا نہیں دال۔ تازی باسی۔ اچھی بُری۔ صبح کو نہیں شام کو۔ اور شام کو نہیں رات کو۔ چوری کرتیں بھیک مانگتیں۔ اور ان بچوں کے پیٹ میں ڈالتیں۔

لاکھ خاک میں مل گئی۔ مگر سارا شہر جانتا ہے۔ کہ پانچ ہزار کا جہیز لے کر میکے سے نکلی۔ تمام بازار کہہ رہا تھا۔ کہ احمد یار کا نصیبہ کھل گیا تم نے دھڑی دھڑی کر کے سب لٹا دیا میرے برتن تم نے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے ڈیڑھ من کے لگن دس دس بارہ بارہ روپے میں کھو دیئے۔ اور چپکی بیٹھی دیکھا کی۔ بیکاری میں بیوی رفیق تھی۔ تحصیلداری میں بیوی دشمن ہو گئی۔ میرا تین ہزار روپے کا زیور مول بیاج میں برابر کیا۔ اگر آج کو وہی میرے پاس ہوتا تو خدا کی قسم مر جاتی۔ اور تمہارے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی۔ سات سو روپے کے جھالے ڈیڑھ سو میں کالے کی نانی لے گئیں۔ اور میں نے اُف نہ کی۔ اماں جان

اللہ بخشے کیسی کیسی بگڑیں۔ اور سمجھایا۔ کہ دیکھو مرد کا اعتبار نہیں۔ مگر میں نے سب تم پر سے نثار کر دیا۔ اور یہی کہا۔ اماں جان زیور کسی کی ذات نہیں۔ راجے کا سنگھار۔ بھوکے کا اُتار۔ جب اللہ دے گا اور بن جائیگا۔ اللہ غنی ہم جان و مال سے نثار رہے۔ اُس کا بدلہ یہ ملا کہ تم ہم سے ایسے بیزار ہوئے کہ صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں ؛

کہاں تک جھینکنا روؤں اور کب تک جھوٹا جھوؤں۔ خدا گواہ ہے مرجاتی اور خط نہ لکھتی نعیم کے دو خط لاہور سے آئے۔ یہ بھیجتی ہوں ذرا غور سے پڑھنا! اللہ اللہ میرا لال میری زندگی میں تم کو وبال ہو گیا۔ اُس نے لکھا ہے۔ چار دفعہ ابا جان کو پچیس روپے کے واسطے لکھ چکا ہوں۔ نہ روپے ہیں نہ جواب! اگر تمہارے پاس اس کی تقدیر کا نہیں ہے۔ تو لکھ دو کہ نام کٹوالے ؛

نعیم کے خط اور حمیدہ کی مجبوری نے اتنا کچھ لکھوا دیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ بیوی بھیک مانگ رہی ہے۔ شریفوں کی بیٹیاں فاقے کرتی ہیں۔ اور ماں باپ کی لاج رکھتی ہیں۔ اللہ عزت آبرو سے اُٹھا لے۔ سب کچھ بھر پایا۔ اب گھر کیا پھرے گا۔ وہ میں بیچاری کس برتے پر میاں کو اپنا کرونگی۔ وہ دل ہی نہ رہا۔ ایک پھپھولا ہے کہ ذرا ٹھیس لگی اور بہہ نکلا ؛

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی ؎

عصمت و حُسن

ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔ کہ سیّد زبیر خاندان عبا سیہ ہی سے تھا۔ مگر اس میں کلام نہیں۔ کہ غالب پور کے سیّد مفلس نادار فقیر کنگال سب کچھ سہی۔ لیکن آن پر جان دینے والے لوگ تھے۔ اللہ بخشے میر نصیر فقیر ہو کر اس رعب کا آدمی تھا۔ کہ بڑے بڑے امیر اس کے نام سے تھرّاتے تھے۔ سچ یہ ہے۔ کہ سادات کا جلال اس کنگال کے چہرے سے خون کی طرح ٹپکتا تھا۔ کیا بات کا پکّا اور قول کا سچّا شخص تھا۔ کنور احمد یار خاں غالب پور کا رئیس مرتے مر گیا۔ مگر سیّدوں کی بیٹی لینی نصیب نہ ہوئی۔ جان کے ساتھ یہ ارمان لے گیا۔ کہ ایک سیّدانی کی پالکی دروازہ پہ اُتروالوں۔ لیکن واہ رے میر نصیر۔ گذارے کے دونوں گاؤں۔ آبائی تنخواہ ہر چیز گنوائی۔ مگر ایک دفعہ انکار کر کے پھر جیتے جی اقرار نہ کیا۔ خدا معلوم اُس مرحوم میں کیا کمال تھا۔ بظاہر تو آمدنی کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اللہ ہی کفیل تھا۔ مگر آخر وقت تک وہی آن بان رہی۔ سارا غالب پور گواہ ہے کہ ڈیوڑھی پر نوکر۔ گھر میں ماما۔ دروازے پر گھوڑا۔ بغدادی جوڑا مرتے دم تک نہ چھوٹا۔ مگر افسوس خاندان کی آن سادات کی شان میر نصیر اپنی جان کے ساتھ لے گیا۔ میر زبیر کو وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ باپ کی آنکھ کا بند ہونا تھا۔ کہ لنگر خانہ بند۔ کپڑوں میں پیوند۔ بچّے ننگے۔ چلو بنیان کھلنگے۔ نوکر چاکر ڈھور ڈنگر چالیسویں سے پہلے ہی سب کچھ ٹھکانے لگ گیا +

جس گھر میں ہر وقت ڈیڑھ دو درجن آدمیوں کا غل غپاڑہ رہتا تھا۔ اب میر وزیر سمیت کل سات دم تھے۔ میاں بیوی۔ سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا۔ گیارہ بارہ برس کی لڑکی۔ دو چھوٹے بچے۔ ایک بڑھیا ماں ۔

صورت شکل کے اعتبار سے سیدانیاں آدمی کا بچہ تھیں۔ مگر عصمت جو بیٹیوں کا جوہر ہے۔ رگ و پے میں موجود تھی۔ ایک نہیں سیدوں کی چار بیٹیاں برس کے اندر اندر رانڈ ہوئیں۔ مگر کیا مجال جو عمر بھر نکاح کا نام لیا ہو۔ چوڑی۔ مہندی۔ گہنا پاتا سب کچھ حرام کیا۔ اور تمام رنڈاپا ساس سسر کی آنکھوں میں کاٹ دیا۔ اللہ اللہ کیسی نیک کوکھ کی بیٹیاں تھیں پیوند زمین ہو گئیں۔ اور دوسرے مرد کو منہ نہ دکھایا۔ چکی پیسی۔ سلائی کی۔ آنکھوں کا تیل نکالا۔ اور پیٹ پالا۔ میر وزیر کی پھوپھی زاد بہن چوتھی کی دلہن رانڈ ہوئی تمام غالب پور نے زور لگایا۔ بلکہ خود میر وزیر کی یہ صلاح تھی۔ کہ نکاح ہو جائے مگر توبہ۔ بہتیرا ہی سر پٹکا۔ لیکن سیدانی راضی ہونے والی نہ تھی ۔

یہی چیز تھی جس نے رئیسوں کو فقیرنیوں کا گرویدہ کر دیا ۔

میر نصیر کے بعد مطلع بالکل صاف تھا۔ بڑا بوڑھا کہو۔ سر دھرا کہو۔ گھر کا مرد کہو۔ جو کچھ تھا لے دے کر ایک بیچارہ وزیر تھا۔ دوپہر کے وقت ایک روز باہر بیٹھا انقلاب زمانہ پر غور کر رہا تھا۔ کہ ایک شخص نے آ کر کہا نواب صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو سچ مچ نواب صاحب سر پر کھڑے ہیں۔ سٹ پٹا گیا۔ کہ کہاں بٹھاؤں۔ وہ سوچتا ہی رہا۔ اور نواب صاحب جھٹ پٹ رومال بچھا تخت پر بیٹھ گئے۔ تھوڑا لمحہ بالکل سکوت

رہا میر وزیر اپنی حالت دیکھ دیکھ کر زمین میں گڑا جاتا تھا۔ آخر نواب صاحب ہی نے اس خموشی کو رفع کیا۔ اور کہا۔ کئی روز سے قدمبوس ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ آپ کو تو ہماری طرف آنا ہی قسم ہے۔ بڑے میر صاحب اللہ بخشے دوسرے تیسرے مہینے کرم فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے مرحوم کے بعد وہ سلسلہ بالکل ہی منقطع کر دیا ؛

میر وزیر۔ کیا عرض کروں۔ مخمصوں میں پھنسا رہا۔ کہ ایک مرتبہ بھی حاضر نہ ہو سکا۔ دن بھر میں ہوں اور یہ کوٹھڑی ہے۔ میر صاحب کی بات اُن ہی کے ساتھ تھی جسقدر اُن کے سامنے افکار دنیوی سے بیزار رہتا تھا اسی قدر اب گرفتار ہوں یہیں صبح اور یہیں شام۔ غرض اسی میں دن تمام ہو جاتا ہے میر صاحب کے دم کی برکت تھی۔ کہ یہ گھر گلزار بنا ہوا تھا۔ کوئی دکھ بیماری کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ نہیں تو ایک چھ برس تک کا حال تو مجھ کو یاد ہے۔ کیا مجال جو کسی کی آنکھ بھی میلی ہوئی ہو۔ ایک آج کا دن ہے کہ گھر ہسپتال بنا ہوا ہے۔ ابا جان کے انتقال کو ابھی پورا مہینہ ہوا تھا۔ کہ دادی اماں کا حال بگڑا۔ خدا خدا کر کے وہ بچیں۔ تو چچا جان کا وصال ہو گیا۔ رات کا ذکر ہے کہ دودھ پیتا بچہ اقبال ہاتھوں میں آگیا۔ میاں ادریس کی کیفیت آپ سن ہی چکے ہونگے۔ کہ وہ کمر ہی توڑ گئے۔ سچ پوچھئے تو خاندان ہی ختم ہوا۔ ایک یہ بھونسڑا ابھی کس نے دیکھا۔ کیا ہو کیا نہ ہو مرے جئے رہے نہ رہے ؛

نواب صاحب۔ درست ہے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ یہ کتنے بڑے شکر کی بات ہے۔ کہ آپ اپنی عزت بنائے بیٹھے ہیں۔ اب رہے واقعات

یہ تو انسان کی جان کے ساتھ ختم ہوں گے ۔

منیر مذیمہ۔ جی ہاں۔ جناب کی تشریف آوری کا میں بہت ممنون ہوں ۔

نواب صاحب۔ بندہ نواز میں تو اپنی غرض لے کر آیا ہوں میری درخواست قبول فرمایئے تو یہ سب سے بڑا احسان ہے ۔

سعید کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ جی چاہتا ہے۔ کہ اُس کے فرض سے سبکدوش ہوں۔ اور آرزو یہ ہے کہ جناب اُس کو غلامی میں قبول فرمالیں اس میں کلام نہیں کہ غفور خانیوں کا پیغام زربفت میں گاڑھے کا پیوند ہے۔ مگر سادات کے در سے خالی ہاتھ نہ جاؤں گا ۔

میرو زیر۔ ان معاملات کو تو مستورات ہی خوب سمجھتی ہیں ۔

نواب صاحب۔ اس کا انتظام میں کر چکا ہوں۔ صرف جناب کے گوش گزار کرنا تھا ۔

نواب صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ میرو زیر نے گھر میں جا کر بیوی سے ذکر کیا۔ وہ نیک بخت تو خدا جانے کب سے بھری بیٹھی تھی۔ سنتے ہی میاں کی جان کو آگئی ۔

"سبحان اللہ! کہیں نواب صاحب کی عقل تو نہیں جاتی رہی۔ آج اٹھارہ برس بعد پھر ہڑک اُٹھی۔ بس معاف کیجئے۔ میں تو صاف کہتی ہوں قبلہ ہو تو نماز نہ پڑھوں۔ میاں ایاز کی بیٹی جو لاکھوں ہزاروں کا جہیز لے کر آئی تھی اُس کا کیا حشر ہوا؟ جل ہی کر مری ۔ ا

جہاں گھوڑے جوڑے تھے وہاں تو یہ مٹی پلید ہوئی۔ یہاں تو سچ مچ

ہی نیلے ڈورے ہیں۔ کسی فقیر کے ہاں جائے گی۔ سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ خدا کی قسم مٹّی بھر چنے ہوں۔ مگر سلوک ہو۔ جب دل ہی ٹھیک نہیں۔ تو ریاست بھی بھیک سے بدتر ہے۔ صاحب مجھ کو منظور نہیں۔ میرا دور ہی سے سلام ہے؟"

میاں۔ ادریس کو اپنی عقلمندی سے بیاہ کر کے تباہ کر چکیں۔ اب حلیمہ بیچاری کی باری آئی۔ ایاز کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ پہلے اپنی تو خبر لو تم تو بڑی اچھی ساس تھیں۔ کہ بہو آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی۔ سچ یہ ہے۔ اُس کا میاں مر گیا۔ تو بلا سے تمہارے ہاتھ سے نجات پائی۔

بیوی۔ واہ واہ واہ! میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ تم ہاتھ دھو کر ہی میرے پیچھے پڑ گئے۔ تمہاری مرضی ہے۔ تو بسم اللہ کرو۔ میرے سر کیوں ہوتے ہو۔

میاں کچھ جواب نہ دینے پایا تھا۔ کہ باہر سے آواز آئی "سواری اُتروالو"۔ پردے میں تو کچھ ایسی دیر نہ لگی۔ ایک اکیلے میرو زیر کا باہر آجانا تھا۔ مگر عقل کا دُشمن جانتا تھا۔ کہ بیگم صاحبہ آنے والی ہیں۔ چاہئے یہ تھا۔ کہ گھر میں تو خاک کے تودے لگے ہیں۔ پہلے ان کو ٹھیک ٹھاک کروا تا لاکھ افلاس تھا۔ مگر غالیچہ نہیں دری۔ دری نہیں چاندنی۔ چاندنی نہیں چادر اُجلی میلی ثابت پھٹی۔ نئی پرانی کچھ تو دالان میں بچھ جاتا۔ گھر درست ہو جاتا۔ گھر والی درست ہو جاتی۔ مگر سادات غالب پور رشتۂ سادات میں جور قیاس کے آدھے خیال کے پونے سمجھ کے بھرپور عقلمند! بیوی سے صلاح کرنے تو مو بیٹھا۔ یہ نہ سوچا کہ راکھ کے ڈھیر آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ دالان

ہیں چھکڑوں کوڑا۔ انگنائی میں ٹوکروں چھلکے، گھر بازار ایک ہو رہا ہے۔ بچے ہیں تو چشم بددور فقیروں کے بھی اچھے ہوں گے۔ بڑی سی لنگوٹیاں باندھے پھٹی سی ٹوپیاں پہنے۔ پھٹی جوتیاں ٹوٹے گنے گنڈے کے چھلکے ٹکڑے چوس رہے ہیں۔ بیوی ہیں وہ نور٘ علیٰ نور۔ سر سے پاؤں تک ایک چیز ڈھنگ کی نہیں۔ ہاتھ ہیکڑا نہ پاؤں پیکڑا۔ ننگے پاؤں۔ سونٹا سے ہاتھوں مہینوں کی ماندی۔ جیسے بری گھر کی باندی ہے ✤

کہاروں کی آواز سنتے ہی میاں تو یہ کہتا ہوا باہر آگیا: "دیکھو اب تم جانو اور بیگم صاحب جانیں۔ جو کچھ کہنا ہے۔ اُن سے کہہ لینا" ✤

بیوی یوں تو بہت بڑھ بڑھ کے بول رہی تھی۔ مگر بیگم صاحب کا نام سنتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سلام کے تو اتنے بھی اوسان نہ رہے کہ کمرے میں گھس کوٹھڑی کھول۔ پچی ہیں سے سفید و دبہ۔ مچان پر سے توشک لا دالان میں بچھادی۔ مگر ہاں تو ایسی سٹی پٹی بھولی۔ کہ جہاں کھڑی تھی وہیں جمی کی جمی رہ گئی ✤

بیگم صاحب تھوڑی دیر تک تو راہ دیکھتی رہیں۔ کہ شاید کوئی اترو انے آئے۔ جب کوئی نہ آیا تو انّا کو آگے بھیج اندر آئیں۔ اب تو بیوی بیچاری کے سر ہی پہ آپڑی۔ جھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور ہنستی ہوئی گلے ملی۔ غریب پر رحم بھی آتا ہے۔ بیگم صاحب کے پاس کھڑی تھی۔ مگر گھر کو دیکھ کر زمین میں گڑی جاتی تھی۔ چبوترہ اور سائبان۔ ڈیوڑھی اور دالان جدھر دیکھتی تھی جھاڑ جھنکار اگ رہا تھا۔ ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی تھی۔ اور دل میں پانی پانی ہو رہی

تھی +

بیگم صاحب ایک جہاں دیدہ عورت صورت دیکھتے ہی تاڑ گئیں۔ منت سے کہنے لگیں "بیوی بھیک مانگنے آئی ہوں خالی نہ پھیرنا"

بیٹی کی ماں۔ بھلا بیگم فقیروں کے گھر میں کیا خاک دھرا ہے؟ فقط اللہ کا نام ہے

بیگم صاحب۔ میرا دل رکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ ہو تو دینا نہ ہو تو نہ دینا +

بیٹی کی ماں۔ گھر آپ کے سامنے موجود ہے۔ بسم اللہ کیجئے!

بیگم صاحب۔ بھیک بھی دو بدلا بھی لو۔ بیٹی دو بیٹا لو +

بیٹی کی ماں۔ آپ کیوں غریبوں کو شرمندہ کرتی ہیں! کجا کمخواب کہاں ٹاٹ۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ روپیہ نہ پیسہ شکل نہ صورت۔ بیگم صاحب غریبوں کی کھپت تو غریبوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ بے ڈھنگی ماں کی پھوہڑ بیٹی۔ سینا نہ آئے۔ پکانا نہ آئے۔ کس برتے پر آؤ کروں جھونپڑوں میں رہنا۔ محلوں کے خواب۔ لینا دینا ہنر سلیقہ کچھ بھی تو نہیں +

بیگم صاحب۔ بوا! یہ تو تمہارے کہنے کی باتیں ہیں۔ تم اسی پھوہڑ بیڈھنگی کالی کلوٹی داغ والی کی ہاں کر لو۔ تو خدا کی قسم باغ باغ ہو جاؤں۔ تمہاری بیٹی ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہیں۔ کالی ہے تو۔ گوری ہے تو بھلی ہے تو۔ بری ہے تو۔ ہمارے تو سر کی سرتاج ہے۔ بہو بیٹیوں کی شکل صورت کا دیکھنا کیا۔ ماں باپ والا کی بیٹی اصل نسل کی سیدانی۔ ہم تو چوم چاٹ کر سر پر رکھیں۔ خدا کی قسم نصیبہ جاگ جائے۔ بھلا میرے ایسے بھاگ کہاں کہ یہ دن

کو بیاہ کرلاؤں؟ ایمان سے کہتی ہوں۔ بس یہ ایک ارمان ہے۔ کہ بہو آن کر اماں جان کہے۔ خدا کے لئے ہاں کرلو۔ تو جان میں جان آئے +

بیٹی کی ناں - ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صلاح کرکے جواب بھیج دونگی۔ جب کچے پکے اقرار تک نوبت پہنچ گئی۔ تو بیگم صاحب رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے اتنا اور کہہ گئیں "بُوا! اگر کل ہاں نہ ہوئی۔ تو پرسوں پھر مجھ کو یہیں دیکھ لینا۔ بیوی میں تو گھر کی مٹی لے ڈالوں گی"+

باپ تو نواب صاحب کی صورت دیکھتے ہی راضی ہو گیا تھا۔ بیگم صاحب نے ماں کو بھی باتوں باتوں میں پرچا لیا۔ سوچتی تھی۔ اور سچ سوچتی تھی۔ کہ ذات میں فی ہے تو بلا سے بات کیسی اچھی ہے۔ عمر بھر سلمہ عیش کریگی۔ کپڑا اللہ، گہنا پاتا۔ نوکر چاکر اللہ کا دیا سب ہی کچھ ہے۔ اب رہا اتفاق وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے +

کیسا انقلاب ہے! وہی خاندان جس میں رئیسوں کا پیغام کوسنا اور دشنام سمجھا جاتا تھا۔ آج اس میں سلمہ کی درخواست ایسا پھوٹی آنکھ کا دیدہ ہوا۔ کہ گھر بھر گردیدہ ہو گیا۔ ماں کا یا تو وہ حال تھا۔ یا یہ کیفیت ہوئی۔ کہ مارے خوشی کے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ باپ نہال نہال تھا۔ البتہ میر وزیر کی ہاں ہانکے پکارے مخالفت کررہی تھیں۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا کون ہے؟ بڑھیا بیچاری نے لاکھ سر پٹکا۔ خاک نہ چلی۔ ادھر نواب صاحب نے برابر جھکا جھٹار کھی تھی۔ میاں بیوی کا راضی ہونا تھا کہ بیگم صاحب کے ہاں عید ہو گئی۔ کیسے وعدے اور کس کے عہد جھٹ پٹ تاریخ مقرر ہو ہوا۔ پیر

کی ساچق منگل کی برات بدھ کی وداع ٹھیر گئی +

میر وزیر کا عالی شان مکان جو ہر وقت سنسان پڑا رہتا تھا۔ پیر کی شام کو مہمانوں سے بھرنا شروع ہوا۔ کہنے کو تو غالب پور میں سیدوں کے چار ہی گھر تھے مگر نصیر کے تعلقات سارے گاؤں کے ساتھ تھے بستی کا رہنے والا شیخ۔ سید۔ مغل۔ پٹھان کون، ایسا مسلمان تھا جو خاندان سلیم کا معتقد نہ ہو؟ شام سے جو عورتوں کی آمد شروع ہوئی۔ تو آدھی رات کو تو تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی +

رات کے دس بجے ساچق آئی۔ روپیہ کی افراط۔ بیٹے کا بیاہ۔ دلوں میں ارمان۔ نام آوری کا دھیان۔ جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ گنگا جمنی ٹھلیاں۔ ایک چھوڑ چار چار سہاگ پڑے سونے چاندی کی سرمہ دانیاں۔ ابری کلاوے عطر تیل۔ نارنول کی مہندی۔ گجرات کا دہکتا ہوا سونا۔ جال کے جوڑے۔ جڑاؤ زیور۔ دلہن والوں کی بھی دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں +

میر وزیر کی بڑی لڑکی سلمہ جو اس وقت دلہن بنی بیٹھی تھی بصورت کے اعتبار سے ایسی لاجواب نہ ہو۔ مگر سیرت کے لحاظ سے خاندان بھر کی ناک تھی سگھڑ۔ فرمانبردار۔ محنتی بہن بھائی کی خدمت گزار۔ ماں باپ کی تابعدار۔ بارہ تیرہ برس کی لڑکی۔ مگر سارے گھر کا دار و مدار اسی پر تھا۔ باہر کا انتظام۔ اندر کا کام۔ باپ کا کھانا پینا۔ ماں کا لینا دینا۔ بہن بھائیوں کا کپڑا لتہ سب اسی کے سر تھا +

سلمہ جیسی بیٹی کی جدائی میر وزیر جیسے باپ کو کافی نقصان تھا جس

تلافی بہت مشکل تھی۔ مگر مسافر کا کوچ اور مقام۔ مہمان کی روانگی اور قیام۔ پردیسی کی صبح اور شام کیا۔ آج نہیں کل۔ اور کل نہیں پرسوں۔ یہ وقت ایک نہ ایک دن آنے ہی والا تھا!

چوتھی کا جوڑا مصالحہ سے لپا ہوا بارہ سو روپے کے مول کا دوپٹہ منہ سے بول رہا تھا۔ زیور کے عدد اکیس۔ پہننے کے جوڑے پچیس۔ القارو دیگیں۔ منوں کھانا۔ دھڑیوں تیل۔ سیروں عطر۔ کھانا دانہ۔ غرض کسی چیز کا ٹھکانا ہی نہ تھا۔

بدھ کی صبح کو چار بجے سے برات آئی۔ رات بھر کے تھکے ہارے مہمان کمر سیدھی کرنے لیٹ گئے تھے۔ دردانگیز وقت تھا۔ کہ چودہ برس کی پلی پلائی بچی ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو رہی تھی۔ لاکھ شادی کا ہنگامہ تھا۔ پچھلے پہر کا وقت۔ صبح کا سہانا سماں۔ بیٹی کی وداع۔ گھر کی ایک ایک دیوار کونے پر حسرت برس رہی تھی۔ سمدھنوں کا اترنا تھا۔ سلمہ کی ہچکی بندھ گئی۔ سوچتی تھی کہ میکے کے چودہ پندرہ سال خواب و خیال ہو گئے۔ گھر چھوٹا گھر والے چھوٹے۔ اب ایک نئی دنیا ہے اور میں ہوں۔ غیر شخص کو اپنا کرنا کیسی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ساس نندوں کی خدمت۔ میاں کی اطاعت۔ آئے گئے کی حکومت۔ گھر بھر کی دباغت۔ کیا کیا کرونگی۔ اور کس کس کو بھگتونگی۔ ایک ایک کی خوشامد۔ بچہ بچہ کی خاطر مدارات۔ ماماؤں تک کی نازبرداری۔ ساری آفتیں مجھ ہی بیچاری کے سر پر آپڑیں۔ ہائے اللہ عمر بھر کا دارومدار اسی پر ٹھیرا۔ ذرا کوئی بیزار ہوا۔ اور سینکڑوں تیر کلیجے کے پار ہوئے۔ ناداری

کے طعنے اور پھر امیری کارخانے۔ دولت ریاست۔ عزت حکومت۔ فقیرنی کی عزت کیا خاک ہوگی۔ وہاں نوکر چاکر ہاتھی گھوڑے۔ روپیہ پیسہ عیش آرام یہاں فاقہ فقر تنگی ترشی۔ دینا ولاتا اللہ کا نام۔ وہ سردار۔ ہم نادار۔ وہ امیر ہم فقیر۔ یہ بیل کیونکر منڈھے چڑھے گی۔ اماں کو جوڑا چڑھاوا عیب ہوگئی۔ مگر میری مٹی کیسی پلید ہوئی۔ ڈھنگ کے دو جوڑے بھی میکے سے لے کر نہ چلی۔ خیر یہ تو ہوا سو ہوا۔ مگر یہ گھر مجھ سے کیا چھوٹا مہمان کی طرح۔ دو ایک دن رہی اور چلی گئی۔ یہ بھی کوئی آنے میں آنا ہے۔ کوئی غیر نہ آیا۔ میں آ گئی۔ ماں باپ بہن بھائی۔ گڑیوں کا گھر پلنگ چارپائی۔ یہ مجھ سے گئے۔ میں ان سے گئی۔ جن کو دم بھر او جھل نہ ہونے دیتی تھی۔ اب برسوں ان کی صورتوں کو ترسوں گی۔ ابھی چھوٹی الماری میں کواڑ بھی نہ چڑھے تھے۔ کہ میں گھر ہی اجاڑ چلی۔ ناشاد رہی نامراد چلی۔ میکا برباد۔ سسرال آباد۔ کس کس چیز کو یاد کروں۔ اور۔ تو اور میری ولایتی بلی کیسی چھوٹی۔ رات بھر پائنتی پڑی رہتی تھی +

سلمی کا یہ خیال جیسا تھا۔ اور جو کچھ تھا اچھا ہو یا نہ ہو۔ مگر سچا ضرور تھا۔ برابر کی لڑکیاں ہر چند سمجھا رہی تھیں۔ مگر اس نیک بخت کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے +

برات کی دھوم دھام۔ دولھا کا تزک و احتشام۔ امیروں کے چوچلے۔ ریاست کے ڈھکوسلے۔ کوسوں نہیں تو میلوں۔ اور میلوں نہیں تو فرسنگوں براتی ہی براتی دکھائی دیئے تھے۔ نکاح کا تقاضا تو صبح ہی سے شروع ہو گیا مگر میر وزیر کی ماں بیچاری پرانے زمانہ کی عورت پابند وضع۔ قول کی پوری۔ بات

کی پچّی زبان کی بچّی۔ میر نصیر کی آنکھیں دیکھے ہوئے۔ ظہیر جیسا شُسرا برتے ہوئے۔ نو ہی "نا" جو اوّل مرتبہ زبان سے نکل چکی تھی۔ آخر وقت تک اُسی پر اڑی رہی۔ بیٹے نے بہتیرا سر پٹکا۔ بہو نے ہزار ہاتھ جوڑے۔ مگر کیا مجال جو بیدانی کے استقلال میں ذرہ بھر فرق آیا ہو +

میر وزیر عجیب مصیبت میں پھنسا ہُوا تھا۔ بات کا پاس۔ برات کی کی شرم۔ باپ دادا کی عزت۔ خاندان کی لاج۔ سید غریب ایک مخمصے میں گرفتار تھا۔ نواب صاحب ہیں کہ تقاضے پر تقاضا۔ آدمی پر آدمی۔ بڑی بی ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ یہ ہی غنیمت تھا۔ کہ انکار کر رہی تھیں۔ ستم یہ کیا کہ بغل میں بُقچہ۔ کندھے پر رضائی۔ ایک ہاتھ میں تسبیح دوسرے میں لوٹا۔ دیوار بیچ دوسرے گھر میں جا کوٹھڑی میں گھس اندر سے کنڈی لگا وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئیں۔ چار بجے کی آئی برات دن کے گیارہ بج گئے۔ میر وزیر پریشان نواب صاحب حیران۔ ادھر براتیوں کی انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اُدھر سمدھنوں کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ سب ہی نے زور لگایا۔ چیخے چلائے۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ کواڑ کھڑکھڑائے۔ مگر اُس نیکبخت کے کان پر جوں نہ چلی۔ نکاح تو الگ رہا۔ یہ اَور فکر سوار ہوا کہ کچھ کھا کر نہ سو رہی ہوں چول اُتارنے کی صلاح ٹھہری +

مکان کی مالک بیچاری غریب سقنی یا تو بیٹھی ہنس رہی تھی۔ یا چول کا نام سنتے ہی سٹ پٹا گئی۔ پاس آ کر کہنے لگی "حضرت جی اچھی تشریف لائیں بیٹھے بٹھائے میرا اور مفت روپیہ کا نقصان کیا" اب تو بڑی بی گھبرائیں۔ مجبور

اُٹھیں۔ ناچار کواڑ کھولے میروزیر نے ماں کی صورت دیکھتے ہی پاؤں پر ٹوپی رکھ دی۔ اور رو کر کہا:-

"برات پھر گئی۔ تو تمام دنیا میں ناک کٹ جائے گی۔ کہ سید زادوں نے بیٹی کی آڑ میں جوڑا چڑھاوا رکھ کر تین ہزار آدمی کی برات کو خالی ہاتھ رخصت کر دیا۔ احمد پور تک کے رئیس اور رئیس زادیاں جن کے گھروں پر ہاتھی جھوم رہے ہیں۔ اس وقت مجھ فقیر کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ غالب پور کا بچہ بچہ رخصت کا انتظار کر رہا ہے۔ اگر آپ کی صلاح نہیں ہے۔ تو بسم اللہ! مگر برات کے اُٹھنے سے پہلے وزیر کا جنازہ صحن میں رکھا دیکھ لینا"

بڑی بی راضی ہونے والی بشر تو تھیں نہیں۔ مگر بات اتنی معقول تھی۔ کہ ہاں کرنی پڑی۔ قاضی جی موجود ہی تھے جھٹ پٹ نکاح ہو گیا۔ نواب صاحب تو خیر رئیس تھے۔ جاگیردار تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا جو کچھ کیا خوب کیا۔ مگر صد آفرین میروزیر کو اس افلاس میں کہ دانت کریدنے کو تنکا تک پاس نہ تھا۔ بیٹی کو اس شان سے رخصت کیا۔ کہ تمام غالب پور واہ واہ کر رہا تھا۔

دُلہن کے سوار ہونے کا وقت آیا۔ تو بھائی کو بُلایا۔ کہ بہن سے آکر مل لے۔ کیسا حسرت ناک وقت تھا سلمہ دلہن بنی چپکی بیٹھی تھی۔ اور گھونگٹ سے زار قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ برابر کی لڑکیاں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ مگر کوئی ایسی نہ تھی جس کی آنکھ سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔ ماں کی کیفیت اور بھی بدتر تھی ہر چند ضبط کر رہی تھی۔ مگر دل تھا

کہ بچہ اچھلا آرہا تھا۔ بھائی کا آکر بہن کو گلے لگانا تھا۔ کہ سب کی ہچکی بندھ گئی ماں کی مامتا نے ایسا جوش کیا۔ کہ بے اختیار ہو کر سلمہ کو کلیجے سے لگا یا۔ نواب صاحب برابر تقاضا کر رہے تھے۔ سیدانیاں برابر روتی دھوتی رہیں اور دولھا نے بسم اللہ کہہ کر دلہن کو گود میں اٹھا پالکی میں لا کر بٹھا دیا۔ سید اللہ آمین کا بچہ۔ امیری کارخانہ۔ شباب کا زمانہ دلہن کی صورت دیکھتے ہی لٹو ہو گیا۔ سونے کی چوڑیاں اور پہنچے تو چڑھاوے ہی میں تھے پازیب۔ توڑے چھڑے میاں نے بنوا دیئے۔ مہینہ ہی بھر میں سلمہ گوندنی کی طرح سونے میں لد گئی۔ خدا کی دین ہے۔ پہلے سال لڑکا۔ دوسرے برس لڑکی۔ پانچویں سال تو سلمہ چار بچوں کی ماں تھی۔ دن بھر کو بھی بیوی میکے جاتی تو میاں پیچھے پیچھے جاتا۔ بیٹیوں کی جگہ بیٹے۔ بیٹوں کی بیٹیاں چار چار پانچ پانچ مامائیں۔ ساس سسرے عاشق زار میاں تابعدار سلمہ نے تو وہ راج کیا۔ کہ آج اچھی اچھی امیر زادیوں کو نصیب نہ ہوگا۔

پہلوٹھی کا لڑکا ارشد ساڑھے چار برس کا ہوا تو بسم اللہ کی شادی ٹھیری۔ بستی بھر میں اعلان ہو گیا۔ کہ آٹھ دن تک کیا ہندو اور کیا مسلمان سب ریاست کے مہمان ہیں جسین پور کے باورچی روشن کھیڑہ کے حلوائی۔ نصیر آباد کے نانبائی۔ منڈی کے قوال جسین گنج کے نقال دور دور سے لوگ آنے شروع ہوئے۔ ایک طرف کڑھاؤ چڑھے۔ دوسری طرف دیگیں کھڑکیں۔ شادی کا دن آیا تو رات کی روشنی ہوئی چراغاں۔ آتشبازی۔ ارشد کی بسم اللہ نے تو سید کی برات کو بھی مات کیا۔ تمام غالب پور جگمگا اٹھا۔

غفور خانیوں نے توراَت کا دن کر دیا۔ سید واڑے کی بہو بیٹیاں جنہوں نے آنکھ کھول کر کبھی ریاست کے رنگ ڈھنگ نہ دیکھے تھے۔ صدر دالان میں اُتری ہوئی تھیں۔ چوکھٹ تک ایرانی قالین کا فرش بیچ میں مسند۔ مسند پر گاؤ تکیہ۔ گاؤ تکیہ کے آگے سلمہ بیگم نبی بیٹھی تھی۔ چاروں طرف سے مبارکبادیں مل رہی تھیں۔ سوطوئیں حلال خوریاں منہاریاں بھتنیاں۔ انیاں جنیاں۔ نقد روپے اور جوڑے لے لے کر دعائیں دیتی جارہی تھیں۔ خدا کی شان ہے۔ وہی سلمہ جو فلاکت کے ہاتھوں قبر کا مردہ بن چکی تھی۔ آج گھر بیٹھے تمام غالب پر حکومت کر رہی تھی۔ حاجتمند تو درکنار اچھی اچھی امیر زادیاں اُس کا منہ تک رہی تھیں۔ آدھی رات کے قریب رات ڈھل چکی ہوگی۔ سعید کی پھوپی زاد بہن بھاوج کے پاس ملنے آئیں۔ سلمہ نند کے واسطے پان بنانے اُٹھی۔ دیکھتی ہے تو بائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں جڑاؤ انگوٹھی ندارد۔ انگوٹھی قیمت میں جس قدر ہو۔ مگر تھی وہ جو ساس نے نشان میں چڑھائی تھی۔ سارا دالان چھان مارا۔ کونہ کونہ چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ مگر انگوٹھی نہ ملنی تھی اور نہ ملی۔ تریاہٹ سمجھ لو۔ ورنہ سلمہ کا مزاج تو ایسا ضدی نہ تھا۔ کہ شادی چھوڑ پچھاڑ اپنے کمرہ میں جا اُلٹی کھٹوائی لے پڑ گئی۔ ماں نے لاکھ سمجھایا۔ باپ نے بہتیرا کہا۔ میاں نے ہرچند خوشامد کی مگر اُس کے سر پر تو ایسا جن سوار تھا۔ کہ ایک سے دو نہ اُترا۔ ساس نے کتنا ہی کہا "بیٹی تمہارے بچوں کا صدقہ گیا۔ ایک نہیں چار انگوٹھیاں اُس سے بہتر منگوا دوں گی۔ تم میرے بچے کی شادی میں کھنڈت نہ ڈالو۔" کھڑی دھو سمجھایا۔ مگر وہ کس کی ماننے والی تھی؟ کمرہ سے باہر نکلنا قسم ہو گیا۔ نواب صاحب

کو خبر ہوئی۔ دوڑے ہوئے آئے۔ بہو کو دیکھا تو نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ اُسی وقت ایک سانڈنی سوار روانہ کیا۔ اور صبح تک بہو کی انگوٹھی منگوا کر دی ۞

ارشد سے چھوٹی سب سے بڑی لڑکی سعیدہ ڈھائی پونے تین سال کی ہوگی۔ مگر لڑکی کیا آفت کی پڑیا تھی۔ ایسی باتیں مغز سے اُتارتی تھی۔ کہ سُننے والوں کے ہوش اُڑتے تھے۔ ماں باپ۔ دادا نانا سب اُس مینا پر پروانہ تھے میر وزیر اس آن کا آدمی کہ بیٹی کے ہاں کا پان کھانا حرام سمجھے۔ دو کوس سے اُس فتنی کو دیکھنے آتا۔ آندھی ہو مینہ ہو مگر وزیر کا پھیرا ناغہ نہ ہو ۞

گرمی کے موسم میں ایک دن خاصی اچھی طرح گھر بھر نے صبح کا کھانا کھایا۔ سعید کھانے سے فراغت پاکر بچی کو پاس لٹا سو گیا۔ ایک بجا ہوگا۔ مینا گھبرا کر اُٹھی۔ دست آیا۔ قے ہوئی سب پریشان ہوگئے۔ شام تک تو بچی کا اللہ ہی حافظ تھا۔ ڈاکٹر حکیم تو ہیں تمام غالب پور اُلٹ پڑا۔ مگر اس غضب کے دست چھوٹے۔ کہ جان لے کر ہی بند ہوئے۔ مینا کی موت نے سلمہ اور سعید دونوں کو بٹھا دیا۔ رات کا واقعہ یہ ہے۔ صبح کو ارشد اسی میں مبتلا ہُوا تیسرے پہر تک ساڑھے چار برس کا پلا پلایا بچہ ہاتھوں میں آگیا۔ سیکڑوں ہی علاج کر ڈالے۔ مگر سلمہ کے کلیجہ پر یہ دو داغ لگنے تھے کچھ بھی نہ ہُوا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے ارشد بھی رخصت ہوا ۞

ارشد اور مینا اکھٹے دو بچوں کا چھوٹنا تھا کہ سلمہ کی کمر بالکل ہی

ٹوٹ گئی۔ سعید کے دل پر ایسا صدمہ بیٹھا۔ کہ دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرتا۔ بسا اوقات بیقرار ہو کر رات کے وقت قبرستان جا نکلتا۔ بچوں کے سرہانے بیٹھ جاتا۔ اور رو کر کہتا:-

"دو کلیجے کے ٹکڑو گھر کو سنسان کیا۔ جنگل آ سوئے"

مینا کچھ ایسے غضب کی باتیں ڈھاتی تھی۔ کہ مائیں تک اُس کے واسطے ٹکریں مارتی تھیں۔ سلمہ کے تو جگر کا ٹکڑا تھا۔ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس پر ارشد کی موت سمندِ ناز پر ایک اور تازیانہ تھا جس نے بالکل ہی دیوانہ کر دیا۔ بیٹھی ہے تو زار قطار آنسو۔ کھڑی ہے تو کھڑی ہی رہ گئی۔ لیٹی ہے تو بچوں کی تصویر آنکھ کے سامنے۔ غرض چار ہی دن میں برسوں کی بیمار ہو گئی۔

ایک چھوڑ دو دو صدمے۔ اور صدمے بھی کیسے؟ داغ! داغ بھی اولاد کے۔ ناشاد و نامراد سلمہ گھٹ گھٹ کر خود بیمار پڑ گئی۔ بخار کھانسی۔ یوماً فیوماً حالت ردی ہوتی گئی۔ چند ہی روز میں نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ دن رات پلنگ پر پڑی رہتی۔ بیوی کی یہ کیفیت دیکھ کر سعید بچوں کا صدمہ بھی بھول گیا۔ دنیا کے علاج کر ڈالے۔ مگر نہ بخار بند ہوا نہ کھانسی کم ہوئی۔

سلمہ کی بیماری ابھی یکسو نہ ہوئی تھی۔ کہ سعید کو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوا۔ دس مہینے کے اندر اندر ماں اور باپ دونوں رخصت ہو گئے۔

سعید مظلوم کی حالت پر رحم آتا ہے۔ خدایا یہ مصیبت دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ بھرا گھر دیکھتے دیکھتے اجاڑ ہو گیا۔ یا وہ حالت تھی کہ آدھی رات تک کان

پڑے آواز نہ سنائی دے۔ یا یہ کیفیت ہوئی۔ کہ دن دہاڑے سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ اسلم اور انعام گنتی کے دو بچے اتنی بڑی محلسرا میں کیا خاک معلوم ہوتے۔ سب سے بڑی بستی مینا کی تھی چاروں طرف جھل جھل پھرتی اور کہنے کو نفی کی خبر لاتی۔ اوپر سے ارشد کی چیخم دھاڑ۔ کہ وہ یار عزیز ہر وقت گھر سر پر اُٹھائے رہتا۔ پھر نواب صاحب اور بیگم صاحب دونوں کی زندگی۔ یہ سب کچھ فنا ہو کر ٹنڈوں ٹوں ایک بی سلمہ رہ گئیں۔ وہ بھی کہنے کو زندہ مگر مردہ سے بدتر ✚

بظاہر نہ سلمہ کا مرض ایسا تھا نہ حالت۔ کہ وہ جانبر ہو سکے۔ اور گو اُس کی موت ماں باپ۔ دادی نانی سب کے واسطے آفتِ ناگہانی تھی۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ وہ مر کر ایک بہت بڑی مصیبت سے چھوٹ جاتی۔ لیکن تقدیر کا لکھا بھگتنا تھا۔ چار دن کو پڑ جاتی پھر اُٹھ بیٹھتی۔ مہینہ بیس روز خاصی رہی۔ دو ڈھائی مہینہ کو پھر گئی گزری ہوئی ✚

رنج ہو یا صدمہ۔ آفت ہو خواہ مصیبت رفتہ رفتہ طبیعت خود ہی مناسبت پیدا کر لیتی ہے۔ کب تک اور کہاں تک۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میاں سعید کو مرے ہوئے بچوں کے ذکر سے وحشت ہونے لگی۔ دل کا درست ہونا تھا کہ آنکھیں کچھ اور ہی ڈھونڈنے لگیں۔ سلمہ میں ناز و انداز اب اللہ کا نام رہ گیا تھا۔ سعید چاہتا تھا۔ بیوی ہر وقت چوتھی کی دُلہن بنی رہیں۔ بیوی کی یہ حالت کہ ماما ئیں بھی اچھی ہوں گی۔ مہینہ بھر کا سر گندھا ہوا ہے تو بلا سے۔ پندرہ دن کے کپڑے ہو گئے تو خبر نہیں۔ ہاتھ میں وہ سفید۔

ہونٹ ہیں وہ خشک۔ کان ہیں وہ ننگے۔ دوچار دفعہ سعید نے کہا بھی۔ مگر
اُس نیک بخت کا دل کچھ ایسا مر گیا تھا۔ کہ کس کی کنگھی چوٹی اور کیسا سرمہ
کاجل۔ دو دو وقت روٹی نہ کھاتی۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ شعبان
کا مہینہ ایسا بھاگوان آیا کہ میر وزیر بھی چل بسے +

پے در پے صدمات۔ متواتر تکالیف و آفات نے سلمہ کی صورت
بگاڑ دی۔ کچھ ایسی دُنیا سے بیزار ہوئی۔ کہ کوئی خواہش بھی دل میں باقی
نہ رہی +

اُدھر میاں سعید ریاست کا مالک ہونا تھا۔ بالکل ہی کھل کھیلے دیوانخانے
میں پلنگ بچھنے لگا۔ باہر کھانا کھانے لگے۔ باپ کی زندگی میں چوری چھپے
ناچ رنگ میں گھڑی کو شریک ہو جاتا تو ہو جاتا۔ اب کھلے خزانے اور ڈنکے
پکارے جلسے ہونے لگے۔ آٹھ آٹھ دن گھر میں جانا قسم ہو گیا۔ اسلم کبھی کھیلتا کھلاتا
باہر آجاتا۔ اور شفقت پدری بھی جوش کرتی۔ تو گود میں لے لیتا۔
رہا انعام وہ تو گویا اُس کا بچہ ہی نہ تھا۔ حسن پرستی کی ہوا ایسی لگی۔ کہ گھر
تک بھول گیا۔ کتنے بڑے رنج کی بات ہے۔ سگی ساس مرتے مر گئی۔
اور کم بخت کو کھڑے کھڑے بھی جانا نصیب نہ ہوا +

اُمی میراثی سلمہ کا گھر خاک میں ملانے کو خدا معلوم کب سے تاک
میں تھا۔ بھتیجی کو ساتھ لے سعد آباد سے چلا اور غالب پور پہنچا۔ اصلی نام جو
کچھ ہو مشہور تو نزاکت ہی ہوا۔ عورت تھی تو ادھیڑ۔ مگر بناؤ سنگار وہ۔ ناز وہ
انداز۔ چٹک مٹک۔ لگاوٹ کا معاملہ۔ غالب پور بھر میں نزاکت کا سکہ جم گیا

بیگل سعید کے دربار میں بھی طلبی ہوئی +

اُمّی تو اس فقرہ کے انتظار ہی میں تھا جو بدار کا آنا تھا۔ کہ باچھیں کھل گئیں۔ مگر حرّانٹ زمانہ کا چھٹا ہوا مکار۔ جھٹ پٹ قلم دوات لا۔ کاغذ نکال لکھنے بیٹھ گیا۔ اور یہ پرچہ لکھ کر حوالہ کیا:۔

"حضور والا! میں غریب۔ بدبخت۔ بدنصیب۔ ذات کا سیّد۔ گھر کا رئیس۔ برادری میں سردار۔ دو گانوں کا نمبردار۔ غالب پور میں یہ سمجھ کر آیا کہ دیس چوری پردیس بھیک۔ یہاں والوں نے اچھی مہمان نوازی کی میراسی۔ کنچن۔ نائی۔ قصائی جو جو دل میں بنا دیا۔ سادات کی عزت غالب پور کی خاک میں ملنی تھی مل گئی۔ آپ کی قدر دانی کا احسان ہے۔ فقیر کے مکان پر تشریف لائیے اور ممنون کیجیے" +

رقعہ کا پہنچنا تھا۔ کہ سعید سیدانی کے دیوانے ہو گئے۔ بیوی سے کچھ ایسی نفرت ہو گئی تھی۔ کہ کم بخت اُس کی صورت سے کوسوں بھاگتا تھا۔ اُمّی کا پرچہ دیکھتے ہی سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اتنا بڑا رئیس چالیس بیالیس گاؤں کا تعلقہ دار۔ عزت آبرو طاق میں رکھ شام ہوتے ہی جا داخل ہوا +

اُمّی اور نزاکت دونوں کی آنکھیں چار گھڑی دن ہی سے دروازہ پر لگی ہوئی تھیں۔ سعید کو آتا دیکھ۔ نزاکت چھم چھم کرتی ہوئی کوٹھڑی میں جا گھسی اُمّی سروقد تعظیم کو کھڑا ہوا۔ دالان میں لایا اور ادب سے سامنے بیٹھ گیا +

سعید۔ مجھے اپنی غلط فہمی کا بہت افسوس ہے +

اُمّی حضور کا کچھ قصور نہیں۔ اپنی تقدیر کی خطا ہے۔ ہماری تو خیر جس طرح گزری بھی گزر گئی۔ دیکھئے اس لڑکی کا مقدر کیا دکھاتا ہے۔ مال گیا۔ جائداد گئی۔ گاؤں گئے۔ اسباب گیا۔ ایک یہ عزت باقی ہے۔ سو اس کا بھی اللہ حافظ ہے۔ خدا کی شان ہے سید امیر شاہ کا پوتا اور در در کی خاک چھانتا پھرے۔ ایک اس نزاکت کی بیڑی پاؤں میں پڑ گئی ہے۔ کسی طرح اس کے دو بول ہو جائیں۔ تو پھر جدھر مُنہ اُٹھے چلا جاؤں +

بجلی کا لیمپ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ اور چھم چھم کی آواز برابر کان میں چلی آرہی تھی۔ بٹاری گھسٹنے کے بہانے سے نزاکت نے اپنی جھلک بھی سعید کو دکھا دی +

جلوہ بے پردہ تو ہوتا ہے فقط ہوش ربا۔

وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے +

رات کا وقت لیمپ کی روشنی۔ دور کی جھلک۔ سعید تو دل وجان دونوں ہی قربان کر بیٹھا۔ آنکھوں کا اندھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ بول اُٹھا۔ "غلامی میں قبول فرمائیے تو میں حاضر ہوں" +

سعید کا اتنا کہنا تھا۔ کہ باہر اُمّی اور اندر نزاکت دونوں کو عید ہو گئی۔ کجا بیچارہ سعید گنگا مسکین۔ بھولا ناتجربہ کار۔ کجا آفت کا پرکالا اُمّی خرانٹ ہوشیار۔ مکار۔ وہ پیچ دار تقریر کی۔ کہ سعید نزاکت کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اُمّی دل میں کتنا ہی نہال ہو۔ مگر کیا مجال جو چہرے پر ذرا مسکراہٹ آئی ہو۔ اُمّی کا اغماض۔ نزاکت کا انداز۔ اشتیاق دیدار۔ پازیب کی جھنکار۔ سب نے مل ملا کر

سعید کے ہوش حواس رکھوا لئے۔ قرار مدار ہو ہوا ہیں ہزار کا مہر مقرر ہو نکاح ہو گیا۔ ہو گیا مزے کی شادی تھی۔ چھ گھڑی رات گئے بات پکی ہوئی۔ بارہ بجے نکاح ہوا۔ ایک بجے بی نزاکت محلسرا میں جا دھمکیں ❊

نزاکت نکاح سے پہلے کوٹھڑی میں تھی۔ تو کیا۔ چلتی ہوئی عورت سعید جیسے ہزاروں دیکھے۔ اور سیکڑوں برتے۔ دو ہی باتوں میں تاڑ گئی۔ کہ بالکل گاؤدی ہے۔ نکاح بندھنے کی دیر ہے جس بل نچاؤں گی۔ ناچے گا۔ آج نہیں کل۔ اور کل نہیں پرسوں غالب پور کی ریاست عباسیوں سے نکل کر میراثیوں کے قبضہ میں آئی۔ عطر میں ڈوبی۔ پھولوں میں لسی محلسرا میں آئی۔ تو جھک جھکا کر ایسی بیٹھی کہ سچ مچ کی دلہن معلوم ہوتی تھی۔ مگر یہ شرم و حیا تھوڑی دیر کی تھی۔ صبح ہوتے ہی ساری قلعی کھل گئی۔ سعید لاکھ سیدھا سادا تھا۔ مگر بچہ نہ تھا۔ اندھا نہ تھا۔ بہت نہیں تھوڑی۔ زیادہ نہیں کم۔ کچھ نہ کچھ تو عقل رکھتا ہی تھا۔ گھونگٹ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ تو ایک عورت ہے عمر کی ادھیڑ صورت کی بگڑی ہوئی۔ عمر کی اتری ہوئی۔ یہ تڑک بھڑک لبس اوپری ٹیپ ٹاپ ہے۔ گھٹنوں میں سر دیکر بیٹھ گیا۔ نزاکت سمجھ تو فوراً گئی۔ مگر اسکا دل شیر تھا۔ جانتی تھی۔ کہ دو چکموں کا محتاج ہے۔ ساری عمر میں لے دے کر عورت کے نام ایک بیوی کی صورت دیکھی ہے۔ سو وہ نیکبخت کتنی ہی کم عمر اور کیسی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ مجھ جیسی چٹک مٹک میرے جیسے داؤں گھات کہاں سے لائیگی۔ پردے کی رہنے والی۔ اللہ آمین کی پالی میکے کی دبی دبائی۔ بال بچوں کی گھری گھرائی میرا مقابلہ کیا خاک کرے گی۔ کچھ دیر تو چپکی بیٹھی رہی۔ مگر پھر تو وہ بیباک

ہوئی۔ کہ جیا دیا سب خاک میں ملا دی۔ ایسے ناک چنے چبوائے۔ کہ بیٹا کو بھی چھٹی کا دودھ یاد آگیا تین چار ہی مہینہ میں چھوکریاں آپائیں لونڈیاں مامائیں سب نزاکت کی خدمت میں جا پہنچے +

یہ تو خدا ہی جانے سعید کی تقدیر بگڑی یا سنوری۔ مگر سچ پوچھو۔ تو مدتوں کی آرزو کا ارمان شب و روز کی تمنا خاصی اچھی طرح پوری ہوئی جن باتوں کا متوقع وہ سلمہ سے تھا۔ وہ سب بلکہ اس سے زیادہ گھر بیٹھے میسر آگئیں ہنسی مذاق۔ تاش پچیسی چوسر گنجفہ۔ مار پیٹ۔ دھول دھپا سب ہی کرم تو پورے ہوئے +

سعید وہ شخص جس نے کبھی آنکھ کھول کر بھی کرودغانہ دیکھی۔ امی کے فقروں۔ نزاکت کی چال بازیوں سے کہاں تک بچتا۔ بے داموں کا غلام بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ ریاست میں بھی امی کا دخل ہوگیا۔ سعید کا تو فقط نام تھا۔ کام سارا امی کر رہا تھا۔ نکاح سے پہلے اتنا تھا روز نہیں تو دوسرے تیسرے گھنٹے کو سلمہ کے پاس ہو آتا تھا۔ نکاح کا ہونا اور نزاکت سے دل لگنا تھا۔ کہ قطعاً آمد و رفت موقوف کردی + چاہئے کہ نزاکت اس پر صبر سے بیٹھ جاتی ہرگز نہیں۔ سلمہ کا کانٹا دن رات اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ ڈرتی تھی کہ بنچوں کی لائی۔ دس برس کی بیاہی دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے۔ کوئی صورت ایسی نکلے۔ کہ اس کا گھر کھوج تک کھود دوں +

اکتوبر مہینہ کا اخیر ہوگا۔ غالب پور میں فصلی بخار کا زور شور ہے سلمہ اور چھوٹا لڑکا انعام تو پندرہ روز سے بخار میں لوتھ پڑے تھے۔ مگر ان بدنصیبوں

کو پوچھتا کون تھا۔ آدھی کا شربت بھی نصیب نہ ہُوا۔ بخار تو نزاکت کا تھا۔ اِدھر ہاتھ پاؤں ٹوٹنے شروع ہوئے اُدھر اُس نے لنگر سر پر اُٹھا لیا۔ بخار کچھ ایسا شدت کا نہ تھا۔ مگر اُس مُروار نے تو وہ فیل مچائے۔ کہ مصیبت کے مارے سعید کو لاڈلی بی بی کی جان کے لالے پڑ گئے۔ دوپہر سے جو آنکھیں بند کر کے پڑی۔ تیمیاں آوازیں دیتے دیتے تھک گیا۔ مگر اُس نے آدھی رات تک آنکھ نہ کھولی۔ ذرا ما مائیں اِدھر اُدھر ہوئیں۔ تو نہایت آہستہ سے میاں کو مخاطب کیا اور کہا:-

"میں تمہارے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ ماموں جان کی صلاح تو ہرگز نکاح کی نہ تھی۔ اور سچ یہی ہے۔ سوکن پر دینا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔ مُوا بخار آج انوکھا تھوڑی چڑھا ہے۔ دیکھے بھی سُنے بھی۔ مگر یہ کیفیت نوج ہو۔ کہ ہڈی ہڈی اور پسلی پسلی توڑ دی۔ اپنا کیا اپنا ساتھ۔ کیوں منہ سے بات نکالی؟ مجھے تو موت یہاں لائی ہے۔ روز نت نئے کرشمے دیکھتی ہوں۔ کل ہی سینہ دو بھری کلیجی لونگوں کا جوڑہ مٹکے پہ سے ملا ہے"۔

سعید۔ شکر ہے تم نے بات تو کی۔ خدا کی قسم میرے تو دو سان جلتے رہے تم میرے منہ پر نہیں رکھتیں۔ تو کیا میں بے خبر نہیں ہوں۔ رتی رتی حال معلوم ہے۔ ماموں جان کی زبانی سب سُنتا رہتا ہوں۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی میرا بس چلے تو اُس بیوی کو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی تک میسر نہ ہو۔

نزاکت۔ یہ تو میں نہیں چاہتی۔ مگر ہاں دیوار بیچ رہنا ٹھیک نہیں میرا

ہی مُنہ کالا کر دو ؛

سلمہ کے بخار میں تو اتنا فرق ہو بھی گیا۔ کہ روز سے باری ہوئی مگر انعام
کو تو کچھ ایسی گھڑی کا چڑھا۔ کہ اکیس دن ہو گئے۔ اور جنبش نہ کی۔ ماما ئیں۔
نوکر چاکر سعید کا اشارہ پاتے ہی نزاکت کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔ ایک
اسلم کی دوا محبت ملنساری نمک حلالی۔ وفاداری کچھ ہی سمجھ لو سلمہ کا غم غلط
کرنے کو باقی رہ گئی تھی۔ عالی شان محلسرا جس میں دن دوپہر جاتے ہوئے
ڈر لگے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ جاڑے کا موسم۔ ہوا کا فرّاٹا۔ رات کا سنّاٹا
اور گنتی کی دو عورتیں۔ وہ بھی ایک مصیبت زدہ دُکھیاری۔ دوسری بڑھیا
پھونس آفت کی ماری بیچاریوں کے کلیجے دہلے جاتے تھے۔ وہ بچوں کا دُبکا
سلمہ کے دل پر ایسا بیٹھا تھا۔ کہ ذرا کسی بچے کا جی ماندا ہوا۔ اور اُس کی جان
نکلی۔ کجا اکیس روز کا بخار۔ گھڑی گھڑی کی خیر منا رہی تھی۔ جو سعید نے دوا
کو بلا کر حکم دیا۔ کہ کل دوپہر تک تمہاری بیوی گوندنی والے مکان میں چلی
جائیں ؛

سلمہ اُس باپ کی بیٹی جس سے ہندو مسلمان تمام غالب پولرزے
مگر افسوس سیدانی کی آن بان کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ ورنہ سعید کی تو مجال کیا
تھی۔ کہ بیوی کو باہر نکال دیتا۔ تقدیر کی خوبی تھی کہ ساس سسرے دونوں
کو موت آ گئی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا۔ تو سعید ایک کیا ہزار
عورتیں لے آتا۔ اور سلمہ لالوں کی لال بنی رہتی۔ میاں کا حکم سُن کر سوکھی ہڈیوں
میں جوش تو آچلا۔ مگر صد آفرین سادات کے خون کو۔ حکم کی تعمیل میں انکار نہ

ہوا گھر چھوڑ چھاڑ دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑ دادا کو ساتھ لے دوپہر سے پہلے محلسرا خالی کر دی +

سلمہ کا گھر سے نکلنا تھا۔ کہ نزاکت کی جان میں جان آگئی۔ مگر چاہتے کہ سلمہ کو ویران کر کے نزاکت اطمینان سے بیٹھ جائے۔ کیا مجال! کچھ ایسی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی تھی۔ کہ گھر چھینا۔ میاں چھینا۔ نوکر چھینے چاکر چھینے۔ جبر بھی چین سے نہ بیٹھی۔ اس کا بس چلتا تو سلمہ اور اس کے بچوں کو کچا کھا جاتی۔ دن رات اسی پیچ و تاب میں غرقاب رہتی۔ جب موقع ملتا اور جہاں گنجائش دیکھتی بات کا بتنگڑ بنا بیٹھتی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسلم جیسا اللہ آمین کا بچہ اور باپ کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا حرام ہو گیا۔ کیا مہینہ اور کس کی تنخواہ۔ نزاکت سے نکاح ہونا تھا۔ کہ نہ سلمہ کے ساتھ دونوں بچوں کو بھی چھوڑ بیٹھا۔ گہنا پاتا۔ کاٹ کباڑ اول تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اور جو کچھ تھا بھی تو کب تک ڈھائی تین ہی برس میں سب ختم ہو گیا۔ لعنت خدا کی سعید پر شریف کا بچہ ہو کر ایسا پاجی نکلا کہ بیاہتا بی بی اور پھول سے بچوں پر دو دو وقت کے کڑاکے گزر جاتے۔ اور بات نہ پوچھتا۔ بلبل اور رحیبا نزاکت کی دونوں لڑکیاں نت نئے کپڑے بدلیں۔ اور اسلم انعام برس کے برس دن چوہا بنے پھریں +

وہی نزاکت جس کی عمر کا بڑا حصہ بدکرداری میں گزرا آج راج دلاری ہو گئی۔ عیش آرام۔ عزت حکومت۔ نزاکت کا مقدر تو ایسا سکندر نکلا۔ کہ اس کے گمان میں بھی نہ ہو گا۔ البتہ بیٹے کا ارمان تھا۔ خدا کی شان وہ بھی پورا ہوا۔ چھٹی کی دھوم دھام دیکھ کر سلمہ کا بیاہ یاد آتا تھا۔ ماماؤں کو جوڑے

نوکروں کو وردی۔ مُلّانوں کو کھانا۔ سیکڑوں روپیہ صرف ہؤا۔ لکھنؤ سے مراثنیں آئیں دریا پور سے بھانڈ آئے۔ آرائش کا انتظام یہ کچھ ہؤا کہ محلسرا منہ سے بول اُٹھی۔ افسوس ہے اُس باپ پر جس کے ہاں ایک وقت میں سات ہزار من بریانی پکے۔ غالب پور کا بچہ بچہ پیٹ بھرے اور فاقہ سے ہوں۔ تو سلمہ کے لال جن کو اتنا حکم نہ تھا۔ کہ چار دیواری میں قدم رکھ لیں +

سچ پوچھو۔ تو بیدا نی بدنصیب پر تو مصیبت کا آغاز اُس وقت سے ہو گیا۔ جب سے ارشد جیسا بچہ رخصت ہؤا۔ اس پر مینا کی موت ایک ایسا چرکا تھا جس نے بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ ابھی پنپنے نہ پائی تھی کہ ادھر ماں باپ۔ اُدھر ساس سُسرے ایک ایک کر کے یہ چاروں رخصت ہوئے۔ آپ پڑی تو ایسی پڑی کہ جیتے ہی جی قبر میں جا پہنچی + بدنصیب تھی وہ خود اور یہی لکھی اُس کی زندگی۔ کہ سوکن دیکھی۔ سوکن کے لیلاڑے دیکھے۔ میاں چھٹا۔ گھر بار چھٹا۔ عیش گیا۔ آرام گیا۔ کیا دل کہتا ہوگا۔ اُس ماں کا جس کے دو بچے جا کر دو باقی رہیں۔ وہ دیکھے کہ گرمی کا لمبا سا دن صاف گزر گیا۔ اور بچوں کے منہ میں اُڑ کر کھیل کا دانہ تک نہ گیا۔ جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں۔ چلّے کی سردی۔ جھاوٹ کے دن۔ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ اور یہ کلیجے کے ٹکڑے گودڑ میں لپٹے سُکڑے پڑے ہیں +

اسلم ڈیڑھ دو ہی برس کا باپ سے کچھ ایسا مانوس ہو گیا تھا۔ کہ جب تک باپ کی گود میں نہ جاتا نیند نہ آتی۔ ذرا باپ کو باہر دیر لگی۔ اور بچہ نے رو رو کر آنکھیں لال کیں۔ سارا دن گزر جاتا۔ جب تک باپ نہ آتا۔ کھانا پینا سب حرام

کر لیتا۔ سوتا تو اُس کے ساتھ۔ کھاتا تو اُس کے ساتھ۔ پیتا تو اُس کے ساتھ
رہتا تو اُس کے ساتھ۔ دیکھنا کیسا عاشقِ زار بچّہ تو کبھی سُنا بھی نہیں۔ کہ دن
رات باپ ہی کی تسبیح ہو۔ نزاکت کے آنے پر بھی اسلم اُسی طرح باپ کو
ڈھونڈتا رہا۔ مگر اُس ظالم نے یہ تو خدا ہی جانے کہ دل سے یا نزاکت کے خوش
کرنے کو تین چار دفعہ ایسا جھڑکا۔ کہ بچّہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ چھ سات
برس کا بچّہ نہ نکاح سمجھتا تھا۔ نہ نگاہ پہچانتا تھا۔ گو ندنی والے مکان
سے بھی جب ہڑک اُٹھتی۔ اور باپ یاد آتا اکیلا محلسرا کے نیچے آکھڑا ہوتا۔
اور کسی نہ کسی بہانہ سے دیکھ لیتا۔ سنگدل باپ نے یہ بھی گوارا نہ کیا۔ اور
بچّہ کے آنے کی قطعی مُمانعت کر دی۔ باپ کی یہ جُدائی ننھے سے کلیجہ پر
ایسا کاری زخم لگا۔ کہ ہر وقت میاں میاں کہہ کر رونا۔ ماما کا کچھو۔ باپ
کی گود تھی۔ روتے روتے آواز بیٹھ گئی۔ بیماری ہوتی تو دکھیاری ماں
جان بیچتی اور علاج کرتی۔ مگر یہ وہ آزار تھا جس کا علاج سلمہ کے اختیار
سے باہر تھا۔ رات بھر جاگتی۔ اور بچّہ کو کلیجہ سے لگائے رہتی۔ مگر اس مظلوم
کی جب آنکھ کھلتی۔ وہی گریہ وزاری اور میاں میاں کی صدا۔ آواز بیٹھی
اور آواز کے ساتھ ہی بخار شروع ہوا ؛

سلمہ کے پاس روپیہ پیسہ تو اب بھی اللہ کا نام تھا۔ مگر سب سے بڑی
دولت یہ دو لال تھے۔ اسلم کو بخار چڑھنا تھا۔ کہ سلمہ کی جان پر بن گئی۔
دوا لی ٹھنڈائی کے قابل تو تھی نہیں۔ گلے سے لگا کر لیٹ گئی۔ بخار چڑھا
تو اُس غضب کا چڑھا۔ کہ ساعت بہ ساعت اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہا تھا۔

اور سلمہ کا دل اُڑ رہا تھا۔ زار قطار رو رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی:-

"الٰہی میرے اوپر رحم کیجیو۔ یہ دو پھونسڑے تیری امانت ہیں"۔

باپ کی محبت اسلم کے دل میں اس درجہ سمائی تھی۔ کہ جاگ رہا ہے تو باپ کا خیال اُس کے ساتھ ہے۔ سو رہا ہے تو اُس کی تصویر سامنے موجود ہے۔ بخار میں ہل ہلا رہا تھا۔ خدا جانے خواب میں کیا دیکھا۔ دفعتہً چونک پڑا۔ اور میاں میاں کہتا ہوا دروازہ کی طرف دوڑا۔ ماں نے جلدی سے پکڑا۔ مگر وہ مچل رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا: "میاں بھاگ گئے۔ اماں میاں بھاگ گئے"۔

ہر چند ماں پکڑ رہی تھی۔ مگر وہ قبضہ میں نہ آتا تھا۔ گود میں اُٹھا کر دروازہ پر لائی۔ روتا ہوا اُترا اور چیختا ہوا باہر گیا۔ یہ ماتا کا جوش تھا۔ کہ دن دہاڑے سلمہ گلی میں نکل بچہ کو اُٹھا گھر میں لے آئی۔ مگر وہ روتا رہا۔ اور یہی کہتا رہا:-

"ہائے اماں میرے سامنے میاں مشکوں پاس کھڑے تھے۔ اِدھر گئے ہیں"!

اسلم کا بلکنا سلمہ کے کلیجہ پر تیر لگ رہے تھے۔ روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ اور ایسا بیہوش ہوا کہ سانس اُکھڑ گیا۔ آدھی رات کا سنسان وقت تھا۔ پھوار پڑ رہی تھی۔ سلمہ بچہ کو گود میں لئے ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔ کلیجہ مُنہ کو آ رہا تھا۔ کہ اسلم نے آنکھ کھولی اور ماں کو دیکھا۔ بچہ کا آنکھ کھولنا تھا۔ کہ ماں نے بے اختیار ہو کر مُنہ پر مُنہ رکھ دیا اور کہنے لگی:-

"میرے چاند میں تیرے صدقے ذرا آنکھ تو کھول"۔

سلمہ کا مُنہ بچہ کے مُنہ ہی پر تھا۔ کہ اسلم کو ایک ہچکی آئی اور ماں کی گود

نہیں رخصت ہُوا ۔

قدرتی طلسمات کی نیرنگیاں پیشِ نظر ہیں۔ اور دنیائے ناپائدار رنگ برنگ کے جلوے دکھا رہی ہے۔ حیاتِ مستعار کی مجلس جمی ہوئی ہے۔ دُور دُور کے فارغ البال شریک بزم ہیں۔ ایک کمسن شہزادی سر پہ تاج گلے میں نولکھا ہار۔ تکیہ لگائے بیٹھی ہے۔ ساغر بلوریں ہاتھ میں ہے۔ اور رنگا رنگ کے شیشے سامنے چُنے ہیں۔ خوشحال ہیں یہ مہمان مگر بھولے ہیں یہ نادان۔ کہ یہاں آکر شریکِ دَور ہوئے۔ ان کا اقبال قمر چاردہم کی طرح چمک رہا ہے۔ ان کے چہرے بشاش۔ یہ خود بشاش میر مجلس کو دیکھ کر نہال نہال ہو رہے ہیں۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ اور ان کی زرق برق پوشاکیں جگمگ کر رہی ہیں۔ بے فکری ان کے سروں پر چاندی کے پھول برسا رہی ہے۔ اور اطمینان زر و جواہر کے چنور ہلا رہا ہے ۔

اے نشۂ دولت کے متوالو ہشیار ہشیار۔ تم تو بالکل ہی سرشار ہو گئے۔ اُٹھو اُٹھو آنکھیں کھولو پھر یہ وقت کہاں اور تم کہاں۔ تمہارا یہ ڈیرا چڑیا رَین بسیرا ہے ۔

دیکھو تمہاری شمعیں جھلملانے لگیں۔ اچھی تھی یہ رات۔ اور غنیمت تھی یہ صحبت۔ مدتوں کے بچھڑے شریک تھے۔ اور بچپن کے ساتھی موجود نیند کے متوالو! باہر نکل کر دیکھو۔ بساطِ فلک چھٹکے ہوئے تاروں سے ہوتی چلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا سماں درہم برہم ہو گیا۔ جاگو جاگو۔ یہ تمہارے ہمدم یہ تمہارے انیس تمہارے پاس سے چلے۔ چلے اور ہمیشہ کو چلے۔ ان کو وداع

کرو۔ ان کا وقت رحلت آگیا۔ یہ حسرت سے تمہارا منہ تک رہے ہیں۔ پیٹ بھر کر بل لو۔ دل بھر کر دیکھ لو پھر نیند بھر کر سو لینا۔ یہ متبرک صورتیں کوئی دم کی مہمان ہیں۔ آن کی آن میں چھپیں چھپیں اور ایسی چھپیں کہ عمر بھر نہ آئینگی۔ اُن کو خدا حافظ کہو۔ اور وعدۂ قیامت پر رخصت کرو۔ صدائے دِرا۔ مرغ کی بانگ مؤذن کی اذان رنگ آسمان یہ سب تم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں:۔

"اللہ کے بندو! رات گئی۔ رات گئی اور رات کے ساتھ وہ بات گئی۔ لطف شبانہ ختم ہوا۔ فلک کجرفتار رنگ بدل گیا۔ وہ روشنی ہو چکی۔ وہ چمک ختم ہوئی۔ چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ تارے جھلملا گئے۔ دیکھو ابر سیاہ نے کوسوں تیرہ و تار کر دیا۔ اس بدنصیب مسافر کو دیکھو۔ رستہ ہولناک راہ کٹھن منزل کڑی اندھیری رات۔ سر پر خدا کی ذات۔ کوئی سنگ نہ ساتھ۔ اکیلی جان اور جنگل بیابان۔ شیروں کی دہاڑ۔ پانی کی بوچھاڑ کلیجہ چار چار ہاتھ اُچھل رہا ہے مگر دکھیارا مصیبت کا مارا سر گاڑی پاؤں پہیا چلا آرہا ہے۔

اے خارستان کے بدیسی مہمان۔ تیری کلفت دشت غربت کی مصیبت۔ بےکسی۔ بےبسی پر ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ اور رفاقت کا کلیجہ ٹکڑے ہوتا ہے۔ یہ رات تیرے واسطے قیامت تھی۔ اور دوسروں کی شب عشرت۔ مگر وہ نشۂ دولت کے متوالے بھی اسی رستے جھومتے جھامتے غفلت کی گٹھڑیاں سر پر۔ کلنک کے ٹیکے لگائے۔ ندامت سے سر جھکائے چلے آرہے ہیں۔

اسلم کی موت نرالی نہ ہو۔ مگر اچنبھا ضرور تھا۔ چار گھڑی دن رہے تک خاصہ بھلا چنگا کھیلتا پھرا۔ جھٹ پٹا وقت ہوگا بخار میں شدت ہوئی۔ نو بجے رات تک تو وہ کبھی کا سدھار چکا تھا ؛

ارشد اور رینا دو ہی بچوں نے سلمہ کی دنیا ختم کر دی تھی۔ اسلم نے دنیا کے ساتھ زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اندھیری رات تھا بٹ کے دن مردے کو کلیجہ سے لگائے گم صم بیٹھی تھی۔ آنکھیں میں آنسو نہ تھے۔ لب پر آہ نہ تھی۔ مگر کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ دفعتہ بچہ کو چارپائی پر لٹا کر پیار کیا۔ ایک چیخ ماری اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی :-

"اپنے لال کے کپڑے لاؤں" ؛

پھٹی سی چادر سر پر ڈالی اور سیدانی بدنصیب گھر میں مردہ چھوڑ کر باہر نکل گئی ؛

جس دن سے لڑکا پیدا ہوا سعید کے ہاں دن عید اور رات شبرات تھی۔ ادھر اسلم حسرت سے ماں کو دیکھ کر دم توڑ رہا تھا۔ ادھر نزاکت اشرفیاں اور روپے تقسیم کر رہی تھی چھٹی کی تقریب رئیس کی خوشی۔ اللہ آمین کا بچہ۔ مجلس اخور توں نے پٹی پڑی تھی۔ سعید کھانا کھا کر مسہری پر لیٹا۔ نزاکت آکر آرام کرسی پر بیٹھی۔ میراسنوں نے لہک لہک کر گانا شروع کیا۔

"میرا چھنک منک بنڑا آیا ری۔ بڑی دور دوں سے بنڑا بلایا ؛
اری بڑے مانوں سے بنڑا بلایا۔ میرا چھنک منک" ؛

چادری کی بھنبیری آواز۔ آدھی رات کا وقت کچھ ایسا سماں بندھا

کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ گیت ختم ہوا تھا۔ کہ دروازہ پر یہ دردناک صدا شروع ہوئی۔ آواز تو غیر معمولی نہ تھی۔ مگر مضمون کچھ ایسا درد انگیز تھا کہ مہمان اور میزبان سب کے آنسو نکل پڑے ۔

بنڑے کے نثار گئی سلمہ ۔ ہریالے بنے کی عمر بڑھے ۔
پھولن جائے یہ بیل تری ۔ یہ لال ترا پروان چڑھے ۔
اس چندر کی جوت اتر دکھن ۔ سنسار میں راج رہے اس کا ۔
اس ایک سے تیرے بسیں گھر ۔ ڈنکا چودیس بجے اس کا ۔
مہکار رہے ان پھولوں کی ۔ سرسبز رہے گلزار ترا ۔
بلبل چہکے چمپا لہکے ۔ شاداب رہے پروار ترا ۔

مجھ پر یہ غضب کیا ٹوٹا ۔ میرا یہ نصیب ایسا پھوٹا
جیتے جی مرا ساجن چھوٹا ۔ مری لاج گئی پردہ ٹوٹا
یہ رین ڈراونی اندھیاری ۔ ہو کالی گھٹا چھائی سر پر
دکھیاری برہ ماری سلمہ ۔ باہر ہو کھڑی تیرے در پر

اسباب بکا زیور نہ رہا ۔ ماں باپ بچی کو موت آئی
ارشاد سی ہری کوپل ٹوٹی ۔ مینا چھوٹی اور سوت آئی
جاڑوں کی یہ راتیں پہاڑ کٹھن ۔ جھپکانی آنکھ حرام مجھے
گاڑھے کی پھٹی سی چادر میں ۔ ہوتی ہے قیامت شام مجھے

یہ چلّے کی سردی کہرہ ٹھٹھر ۔ اور بچّے پھریں سوں سوں کرتے +
گھر بھر میں روٹی کا نام نہ ہو ۔ انجام بچّے مرتے مرتے +
اسلم میرا لال ہو یاد اگر ۔ تھی جس کی دوا جھومر لائی +
گھر میں ہے پڑا تنہا مردہ ۔ میں اُس کے کفن کو ہوں آئی +
ہے نام کی لاج فقط باقی ۔ مُردہ تو کسی کا رہے نہ رہا
مل جائیگی خاک میں سب توقیر ۔ گر اس کو کفن غیروں نے دیا +

اس آخری خدمت کو اُس کی ۔ گر کچھ بھی کمائی باپ کی ہو +
اُٹھوا دو مرا بچہ صاحب ۔ یہ اُس پہ عنایت باپ کی ہو +
کچھ بھی نہ جواب آیا میرا ۔ میں کیا کروں ہائے کہاں جاؤں +
میکے میں ہے نام اللہ کا بس ۔ بچّہ کا کفن کس سے لاؤں +

اے گھر والی پیاری بی بی ۔ بچّوں کا تصدّق دے بیگم +
آباد رہے اولاد تیری ۔ خوش حال رہے تیرا یتیم +
اُٹھوا دو نے مرا مردہ بی بی ۔ زندہ تری سب اولاد رہے +
تو شاد رہے آباد رہے ۔ سلمہ یہ ساعت یاد رہے +

اسلم کے کفن کارن نکلی ۔ میں آئی تمہاری گلی بابا +
تم چین کرو آرام کرو ۔ سلمہ اس در سے چلی بابا +

تصانیف مولوی راشد الخیری دہلوی

صبح زندگی نسیمہ کے بچپن سے شادی تک کے حالات جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لڑکی کی تعلیم و تربیت کیونکر کرنی چاہئے۔ قیمت ۱۲؎

شام زندگی صبح زندگی کا دوسرا حصہ جس میں نسیمہ کی شادی سے موت تک کے حالات درج کئے گئے ہیں قیمت ۱۲؎

شب زندگی اسی سلسلہ کی تیسری کتاب۔ جس میں موت کے بعد کی سرگزشت ہے۔ قیمت جلد اوّل ۸؎۔ دوم ۸؎

منازل السائرہ اس کتاب میں سائرہ کی زندگی کے حالات نہایت دلچسپ اور نصیحت آمیز طریق سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت جلد اوّل ۱۰؎۔ دوم ۱۰؎

طوفانِ حیات مولانا راشد الخیری نے شرک و بدعات کا یہ قصہ ایسے دلاویز پیرائے میں لکھا ہے۔ کہ ان کے خوفناک نتائج بچپن ہی سے لڑکیوں کے دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں (۸؎)

سنجوگ مصورِ غم مولانا راشد الخیری کی اس کتاب میں ایک ایسی مصیبت زدہ لڑکی کی داستان ہے جس کا نکاح والدین نے سوچ سمجھ کر نہ کیا۔ اور فریقین کی طبیعتوں کا اندازہ نہ لگایا۔ بلکہ روپے اور دولت پر پیاری

مسلم پرنٹنگ پریس لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور میں باہتمام کرامت علی۔ چھپا شائع کردہ سید ممتاز علی دار الاشاعت پنجاب